فاروقی

# تعارف و تبصرہ

# علامہ انور شاہ اور اُن کے تذکرہ نگار

از


سیّد محمّد فاروق بخاری

عربی، گورنمنٹ کالج سوپور (کشمیر)

کالر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ


قیمت ۲ روپیہ

# تعارف و تبصرہ

## علامہ انور شاہ اور انکے تذکرہ نگار

از

سید محمد فاروق بخاری

لیکچرر شعبہ عربی گورنمنٹ کالج سوپور (کشمیر)

و

ریسرچ اسکالر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

# فہرستِ مضامین



## مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# پیش لفظ

علماءِ اسلام بالخصوص علماءِ دیوبند میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری جس مقام و مرتبہ کے مالک ہیں وہ اہل علم پر روشن ہے اپنے علمی تبحر، قوتِ حافظہ، دقتِ نظر، شانِ درس و تدریس اور تقویٰ و طہارت میں انہوں نے جو عظمت و رفعت پائی وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ اُن کے بلند پایہ معاصرین نہ صرف شاہ صاحب کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کے قائل تھے بلکہ فخر کے ساتھ ان سے استفادہ کرتے تھے۔

جب علامہ کشمیری نے وفات پائی تو اُن کے تلامذہ اور متوسلین نے فوراً اُن کے حالاتِ زندگی اور علمی کمالات قلمبند کرنے اور انہیں عام کرنے کی جانب توجہ کی۔ بلکہ کہنا چاہیے مجلس علمی ڈابھیل اور پھر کراچی اسی مقصد کیلئے ہی وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ چند سال کے اندر اندر کئی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں۔ بالآخر یہ سلسلہ کبھی نہ رکا اور آج تک

علامہ کشمیری کے علوم وافادات عام کرنے اور ان پر تحقیق و تمحیص کرنے کا کام برابر جاری ہے۔

علامہ کشمیری کی ہمہ جہتی دیو قامت شخصیت پر اگرچہ بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس کے باوجود کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے علوم و کمالات پر تحقیق کرنے کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایک کتاب کے پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں:

"تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک مقالہ سے اس کا پورا حق ادا ہو گیا۔ زمانہ کا کاروان علم و تحقیق کے میدان میں جتنا آگے بڑھتا رہے گا۔ حضرت الاستاذ کے علمی کمالات اسی قدر زیادہ آشکارا ہوتے رہینگے"۔

راقم سطور کو مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت و محبت ورا ثتاً ملی ہے اور اس نے میرے دل و جان میں اُس وقت جگہ پکڑ لی ہے جب شاید حیات کی تعریف بھی نہ جانتا تھا بقول شیخ ابن الفارض رح

اتانی هواها قبل ان اعرف الهوی - فصادف قلبی فارغاً فتمکنا

اس عقیدت کو عملی صورت دینے کیلئے میں کئی سال سے شاہ صاحب کی حیات اور کارناموں پر تحقیق کرتا ہوں اور آج بھی یہ کام جاری ہے۔ اس میدان میں مجھے اُن کتابوں کو بھی مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا جو آج تک چند اصحاب علم و قلم کی طرف سے منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔ علامہ کشمیری پر آج تک بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر چند

کتابیں جو ہمیں دستیاب ہو سکیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) جزاء الاحسان : مولانا کریم بخش گورنمنٹ کالج لاہور۔

(۲) تذکرۃ الانور : مولانا عتیق احمد صدیقی ایڈیٹر سلطان العلوم دیوبند

(۳) مولانا انور شاہ کشمیری : سید منظور حسن رضوی

(۴) سوانح مولانا انور شاہ ۔ پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی

ان کتابوں کو چھوڑ کر شاہ صاحب پر صحیح مستقل کتابیں اور بہت سے مضامین ہیں جو اس وقت راقم کے پیش نظر ہے۔ یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ ان پر تبصرہ لکھا جائے جس کی بڑی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس سے شاہ صاحب پر تحقیق کرنے والوں کو ایک تو ماخذ کا پتہ چلے گا اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کتابوں میں جو کمی رہ گئی ہے اس کی طرف توجہ دی جائے گی۔ مولانا انور شاہ کشمیری کے علوم و کمالات پر تحقیق کرنا جتنی بڑی سعادت ہے اتنا ہی یہ کام بڑا مشکل بھی ہے۔ ظاہر ہے جو شخص اپنے بارے میں پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہو کہ

| | |
|---|---|
| ما من فن الا ولی فیہ رائ | ایسا کوئی فن نہیں ہے جس میں |
| الا الفقہ فانی فیہ مقلد | میری اپنی رائے نہ ہو۔ ہاں ! |
| لحنفی [1] | فقہ میں میں خاص مقلد ہوں۔ |

علم بلاغت و معانی کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری ۔ مطبوعہ مصر ج ۳ ص ۱۷

قد أودع الله في قلبي معياراً لذخيرة البلاغة فلست فيها مقلداً وأعطاني بصيرة أدرك بها ما وراءها ۲

اللہ نے میرے دل میں بلاغت کا ایک معیار ودیعت کیا ہے۔ میں اس میں کسی کی تقلید نہیں کرتا ہوں بلکہ مجھے اس میں ایسی بصیرت عطا کی ہے جس کے ذریعہ اس علم کے مراتب پا سکتا ہوں۔

اسی بے مثال علمی تبحر اور مجتہدانہ بصیرت کی طرف مولانا محمد یوسف بنوری نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

لو كان في عصر الغزالي والرازي وابن دقيق العيد وابن تيمية العراقي وابن حجر العسقلاني لكان درة فاخرة من عقد تلك القرون المباركة بل شمساً نيرة من الشموس المستنيرة اليوم على سماء التاريخ الإسلامي في عهد الارتقاء وعروج العلوم ۳

اگر وہ (علامہ کشمیری) غزالی، رازی، ابن دقیق العید، ابن تیمیہ عراقی اور ابن حجر عسقلانی کے زمانے میں ہوتے تو اس لڑی میں دُرِّ بے بہا ہوتے، بلکہ اُن آفتابہائے علم و فضل میں خورشید تاباں کی طرح ہوتے جو اسلامی تاریخ کے عروج و اقبال اور اسلامی علوم کی انتہائی ترقی کے زمانے میں گزرے ہیں۔

---

۲ نفحة العنبر من هدي الشيخ الأنور ص ۲۷

اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میدان میں کسقدر پھونک پھونکر قدم اٹھانا ہے اور قدم اٹھانے والا کتنا آراستہ اور مکمل ہونا چاہئے چنانچہ شاہ صاحب پر کام کرنے والوں میں ہم نے چند حضرات ایسے بھی پائے کہ اگر انہیں کعبہ جانا تھا تو وہ سیدھے ترکستان پہنچ گئے ہیں۔

مجھے اس خدمت کی طرف اپنے محترم و معظم استاد جناب پروفیسر مختارالدین احمد صاحب صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے متوجہ کیا۔ جنکی سرپرستی میں، میں ایک ایسے موضوع پر تحقیق کرتا ہوں جس میں حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ ہوگا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب پر میں جو کچھ بھی کام کرتا ہوں اس کی محرک عصر حاضر کے نامور عالم اور محقق پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہ العالی کی شفقت اور حوصلہ افزائی ہے۔ یہ انہی کی بزرگانہ شفقت اور خردنوازی کا نتیجہ ہے کہ مجھ میں بھی علامہ کشمیری کی چند کتابوں کی ورق گردانی کی ہمت پیدا ہوگئی۔ شاہ صاحب پر تحقیق کرنے والوں کو اس کتابچہ سے اگر کوئی نفع پہنچے گا تو اسے حضرت مولانا اکبرآبادی کی فیض صحبت کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ اور اس میں جو غلطیاں اور خامیاں ہونگی اُسے راقم الحروف کی کم ظرفی اور کم علمی پر محمول کرنا چاہئے۔ اگر تربیت پانے والا

کم مایہ اور کند فہم ہو تو اس میں اُس کے مُربّی
کا بھلا کیا دخل ہے! بلکہ اُس کی اپنی بدقسمتی ہے۔

محمدؐ فاروق بخاری (کشمیر)
(ریسرچ لائبریری)
واقع کشمیر یونیورسٹی سرینگر
۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتابچہ میں ہم سب سے پہلے چھ کتابوں پر تبصرہ درج کرتے ہیں اور آخر پر چند اہم مقالات کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہیں۔

(۱) نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور، (عربی)
مولانا محمد یوسف بنوری رح

یہ کتاب مولانا انور شاہ کی حیات اور کارناموں پر ایک مستند اور معتبر کتاب ہے جو علامہ کشمیری کے تلمیذ ارشد مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری رح کی یادگار ہے۔ یہ کتاب علامہ کشمیری کی وفات کے چار سال بعد شائع ہوئی۔ اس طرح یہ کتاب شاہ صاحب پر لکھی گئی کتابوں میں شاید سب سے قدیم کتاب ہے۔ کتاب شائع ہونے پر ملک کے مؤقر جرائد میں اس پر تبصرے شائع ہوئے اور علماء کرام نے تحسین تقریظیں ثبت کیں۔ "معارف" اعظم گڈھ نے اس پر ایک طویل تبصرہ لکھا جس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے علمی تبحر و وسعت نظر اور زہد و ورع کے لحاظ سے اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ وہ جملہ علوم خصوصاً حدیث و رجال کے بحر زخار تھے۔ ان کی ساری زندگی اس فن شریف کی خدمت

اور اشاعت میں بسر ہوئی۔[1]

علامہ سید سلیمان ندوی ؒ نے مولانا محمد یوسف بنوری کو علامہ کشمیری کے اُن پانچ تلامذہ میں سے ایک شمار کیا ہے جنہیں وہ "مستقل دائرۂ علم" سے تعبیر کرتے تھے۔[2] مصر کے مشہور فاضل علامہ محمد زاہد الکوثری ؒ نے مولانا بنوری کی مشہور کتاب "بغیۃ الاریب" پر تبصرہ کرتے ہوئے آج تقریباً چالیس سال پہلے یہ وقیع الفاظ لکھے تھے۔ حضرت صاحب الفضل و الفضیلۃ المتحلی بالاخلاق الجمیلۃ العلامۃ الادیب والرکن اللبیب السید محمد یوسف البنوری۔[3] مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا وجود اپنے استاد کی محبت و عقیدت میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ صحیح معنوں میں اس دور میں اپنے استاد کے قائمقام تھے۔ ان کے قلم سے جو کچھ بھی نکلا، چاہے وہ مستقل کتاب ہو یا مقالہ، اور موضوع بھی چاہے کونسا ہو اُن کے سامنے علامہ کشمیری کا کوئی نہ کوئی افادہ اور ارشاد ہوتا تھا اور وہ اُسے نقل کرتے تھے۔ رسالہ "بینات" کراچی کو انہوں نے علامہ کشمیری کے

---

[1] معارف، فروری ۱۹۳۲ء: ص ۱۵۵-۱۵۶!

[2] یادرفتگاں، کراچی ۱۹۵۵ء

[3] بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب ص ۶ مطبوعہ مصر ۱۹۳۹ء

علوم شائع و ذائع کرنے پر ہی وقف کیا تھا۔

زیر تبصرہ کتاب کا پیش لفظ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے اس میں مولانا عثمانی نے مصنف کتاب کی اِن الفاظ میں تعریف و تحمید کی ہے: "آپ کی علمی قابلیت ادبی لیاقت اور دینی صلاحیتوں کا میں پہلے سے معتقد تھا مگر اُتنا نہیں جتقدر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہو گیا ہوں"۔[۱]

مولانا بنوری نے اس کتاب میں شاہ صاحبؒ کی حیات، علمی کمالات، تحریری خدمات، مذہبی اصلاحات اور تجدیدی کارناموں پر احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اسلئے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شاہ صاحب پر کوئی تحقیق کرنے والا اس کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتا ہے۔

کتاب "مقدمہ" سے شروع ہوتی ہے جو چار صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ جس میں علامہ کشمیری کے فضائل و کمالات کا اجمالی خاکہ اور کتاب لکھنے کے محرکات پیش کئے ہیں پھر پندرہ صفحات میں اُن کی زندگی اور زندگی کے مختلف ادوار کا تذکرہ لکھا ہے مگر اس میں مصنف محترم نے دیوبند میں ۱۹۲۷ء کی مشہور سٹرائیک اور شاہ صاحب اور اُن کے رفقاء کے استعفیٰ کے بارے میں چند مختصر اشارات کے بغیر کچھ

بھی نہ لکھا ہے البتہ انہی مختصر اشارات سے اُن بڑے بڑے حادثات وواقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ جنہوں نے اُس وقت جو ہندمیں شکست وافسردگی کا ماحول پیدا کر دیا جس میں "کتنے ہی دل مضمحل ہوئے اور کتنی ہی روحیں پھٹنے کے قریب ہوئیں۔ علامہ کشمیری غموں سے چور ہوئے اور اُن کے زخم تادم وفات مندمل نہ ہوئے۔ اگرچہ انتہائی صبر وشکیبائی سے کام لیکر زبان سے کچھ نہ کہتے تھے مگر دل خون بہا رہا تھا۔ اس سے قبل فتنہ مرزائیت نے اُن کا دل نگھل کر رکھدیا تھا اور اب جو زندگی باقی رہ گئی تھی اس کے خاتمے کا باعث یہی فاجعۂ کبریٰ اور داہیہ عظمیٰ ہوا مولانا بنوری فرماتے ہیں (اور فرمانے کا حق رکھتے ہیں) کہ شاید علامہ کشمیری نے اپنے مندرج ذیل اشعار میں اسی جان گُسل اور روح فرسا حادثے کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

فقدت بہ قلبی وصبری وسلوتی
ولم الق الا ریب دھر ذمیما
ومن عبرات العین ما لا اسیغہ
ومن غلیات الوجد ما کان ھمھما
ومن نفثات الصدر ما لا ابثہ

ومن نجعات الدهر مافد تجمّا
تكففت دمعي اوكففت عنانه
وصار مجاري الدهر حتى تقدّما

سوانح کے بعد علامہ کشمیری کے چند عادات و خصائل اور فضائل وکمالات جیسے قوتِ حافظہ، سرعت مطالعہ، تبحر علمی اور جامعیت قوتِ استحضار وغیرہ بیان کئے ہیں جن کی وجہ سے انہوں نے اپنے رفیع القدر معاصرین میں بھی ایک انفرادی مقام حاصل کیا تھا۔

اس کے بعد دینی علوم جیسے قرآن، حدیث، فقہ میں اُن کی بصیرت اور وسعت نظر بیان کیا ہے۔ یہ تذکرہ مجمل ہونے کے باوجود شاہ صاحب کا مقام متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔ درس حدیث بیان کرنے کے دوران شاہ صاحب کا وہ خطبہ تھوڑے سے اختصار کے ساتھ[۲] کتاب میں شامل کیا ہے جو مشہور مصری فاضل اور مصلح علامہ رشید رضا (تلمیذ رشید شیخ محمد عبدہ شاگرد جمال الدین افغانی) کے ورود دیوبند پر انہوں نے برجستہ اور بزبان عربی سنایا تھا۔ اُن کی فقہی خدمات پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی واضح کیا ہے کہ علامہ کشمیری نے کن وجوہ کی بنا پر فقہ حنفی کی خدمت کی اور فقہ میں وہ جامد مقلد تھے یا محقق مقلد۔ اس بحث میں علامہ کشمیری سے یہ تحقیقی بات بھی نقل کی ہے کہ اپنی

---

۲؎ پوری تقریر کے لئے ملاحظہ ہو "القاسم" دیوبند ج ۳ شمارہ ۲، ۱۳۳۰ھ

تیس سالہ تدریسی خدمت کے بعد ہم پر یہ بات متحقق ہو گئی کہ دو مسئلوں کے سوا امام حنیفہ رح کے تمام مختارات قرآن اور سنت سے مؤید اور مشید ہیں"۔ اور یہ کہ "ہم نے سو سال تک حنفی مذہب کے بجڑے مضبوط کر کے رکھدئے۔ چار صفحات پر علامہ کشمیری کے علوم عربیہ ادبیہ خصوصاً معانی، بیان اور بدیع میں کمالات بیان کئے ہیں بارہ صفحات میں شاہ صاحب کی تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے اس میں "فیض الباری" اور "الوار المحمود" کا ذکر نہیں ہے یہ اسلئے کہ دونوں کتابیں زیر تبصرہ کتاب شائع ہونے کے بعد منظر عام پر آئیں، البتہ "العرف الشذی" کا تبصرہ موجود ہے تصانیف اور تالیفات کا تعارف پیش کرنے کے بعد علامہ کشمیری کے چند افادات و تفردات پیش کئے ہیں جن سے اُن کے علم و فضل، جدت و ابتکار اور ذہانت و ذکاوت پر روشنی پڑتی ہے یہ افادات اور مباحث قرآن و حدیث، فلسفہ و کلام اور تاریخ و جغرافیہ سے متعلق ہیں، تاریخ سے متعلق علامہ کشمیری کی مشہور کتاب "عقیدۃ الاسلام" کا ایک طویل اقتباس بھی نقل کیا ہے، جو یاجوج و ماجوج، سد ذوالقرنین اور شخصیت ذوالقرنین کی تعیین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس بحث کے آخر میں اپنی طرف سے چند تنبیہی سطور لکھے ہیں۔ ان میں ایک مقام پر مولانا ابوالکلام آزاد کے

خلاف قرآن و حدیث اور اجماع و تواتر اقوال و آراء پر کڑی تنقید کی ہے۔ جو انہوں نے سورۂ کہف کی تفسیر میں بڑی جرأت کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم یاجوج و ماجوج کا آخری خروج بھی ہے۔ سات اوراق میں علامہ کشمیری کی عربی شاعری کا تعارف پیش کیا ہے اور ان کی سخن فہمی اور سخن گوئی پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے یہاں مولانا یوسف صاحب بنوری نے بڑی خدمت یہ کی ہے کہ شاہ صاحب کے چار طویل عربی قصائد اور کچھ متفرق اشعار اپنی کتاب میں محفوظ کئے ہیں یہ ان کی بڑی علمی خدمت ہے۔ اس کتاب کے بغیر قصائد کسی اور کتاب میں نہیں ملتے ہیں ان میں ایک عربی نعتیہ قصیدہ بھی ہے جو اپنی اعلیٰ ادبیت کے لحاظ سے پورے عربی لٹریچر کے چند گنے چنے نعتیہ قصائد میں ایک ہے۔ مشکل الفاظ کی آسان عربی میں تشریح لکھی ہے اس کے بعد علامہ کشمیری کے تجدیدی کارناموں بالخصوص فتنۂ مرزائیت کو نیست و نابود کرنے کی ہمت و کوشش پر روشنی ڈالی ہے۔ چند اوراق میں علامہ کشمیری کے شمائل بیان کئے ہیں اسی کے ساتھ مولانا محمد یوسف کاملپوری کا ایک مبسوط مقالہ درج کیا ہے جس کا مرکزی مضمون علماء ہند بالخصوص علامہ کشمیری کے علمی و دینی کارنامے ہیں۔ آخر میں چند تمہیدی اور تعزیتی کلمات درج کئے ہیں جو علامہ کشمیری کے معاصرین نے ان کو بحالت زندگی

اور بعد وفات اُن کی شان میں کہے ہیں۔ ان میں شیخ الہند،
مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد
مدنی، مفتی اعظم محمد کفایت اللہ، مولانا حبیب الرحمان عثمانی،
علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ رشید رضا مصری جیسے اکابر
و اماثل کے نام قابل ذکر ہیں۔ سب سے آخر میں چھ مراثی نقل کئے
ہیں جو علامہ کشمیری کے عظیم القدر تلامذہ نے اپنے جلیل الشان
استاذ کی وفات پر کہے ہیں۔ پہلے چار قصائد بالترتیب مولانا
محمد ادریس کاندھلوی، مولانا میرک شاہ اندرابی (کشمیری)
مولانا محمد یوسف کاملپوری اور مولانا محمد یامین سہارنپوری
کے ہیں۔ آخری دو خود مصنف کتاب مولانا بنوری کے عواطف
و تخیل کے نتائج ہیں۔ یہ سارے قصائد انتہائی درجے کے فصیح
و بلیغ ہیں اور ہندوستانی عربی شاعری میں شاہکار
"master piece" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب فصیح و بلیغ عربی زبان میں لکھی
گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان و ادب مکمل طور پر
مولانا بنوری کے تابع اور مطیع ہے۔ یہ کتاب لکھنے کے وقت مولانا
بنوری کی عمر تیس سال کے قریب تھی اس کے بعد پورے چالیس سال
تک لکھا اور عربی میں ہزاروں صفحات علمی اور تحقیقی یادگار

کے طور پر چھوڑے۔ اپنی زبردست عربی دانی میں انہیں عالم
عربی میں بھی بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ وہ اسلامی ممالک
کی کئی دینی اور علمی اکادمیوں کے قابل احترام ممبر بھی تھے۔
"نفحۃ العنبر" پہلی بار ۱۹۳۶ء میں مجلس علمی ڈابھیل (گجرات)
سے شائع ہوئی۔ اور بعد میں کئی اضافات کے ساتھ اس کا
دوسرا ایڈیشن مجلس علمی کراچی سے شائع ہوا۔

۲۔ انوار انوری: مولانا محمد انوری لائلپوری المتوفی ۲۲ جنوری ۱۹۷۰ء
مولانا انوری، علامہ کشمیری کے تلمیذ رشید ہونے کے علاوہ اُن کے
خدام اور علمی معاونین میں سے ایک تھے۔ علمی استفادہ شیخ الہند
مولانا محمود حسن صاحب رح سے بھی کیا ہے اور روحانی ارشاد اور تربیت
نفس کیلئے حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رح کے فیوض حاصل
کیے۔ خود مولانا رائے پوری کو بھی علامہ کشمیری سے شرف تلمذ حاصل
تھا۔ سیرۃ النبی ﷺ، اربعین من احادیث النبی ﷺ اور السنن
والآثار اُن کے علمی یادگار ہیں۔ موخرالذکر کتاب احناف
کی تائید میں لکھی گئی ہے اور تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔[1]
مرحوم متبحر عالم تھے مگر تجدید و تبلیغ دین اور اصلاح نفس
و تربیت اخلاق میں خاص طور پر مشہور ہوئے۔

زیر تبصرہ کتاب پاکستان میں شائع ہو چکی ہے اور اس کے

---

[1] [illegible]

طویل طویل اقتباسات ہند و پاکستان کے مختلف دینی اخبارات و
جرائد میں بالاقساط شائع ہوئے اُن کے مضامین پڑھ کر معلوم ہوتا
ہے کہ یہ کتاب علامہ کشمیری کے علوم و کمالات کا ایک گرانقدر مجموعہ
ہے۔ اسمیں اُن کے علوم و افادات کے نمونے بھی ہیں، زندگی کے
حالات و واقعات بھی، صورت و سیرت کے جلوے بھی اور باطنی اور
روحانی فیوض و کمالات بھی۔ جہاں اُن کے علمی کمالات بیان
کرنے کی طرف رخ کیا ہے تو قرآن و حدیث تک ہی محدود نہیں رہے
ہیں بلکہ علوم عقلیہ اور شعر و ادب کے نمونے پیش کر کے علامہ کشمیری
کی علمی جامعیت بھی واضح کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال
نے ایک بار شاہ صاحب سے فرمایا کہ نیوٹن نے زمان و مکان پر
بہت کچھ لکھا ہے کیا آپ نے اس کا مطالعہ فرمایا ہے؟ علامہ کشمیری
نے جواب دیا کہ میں نے نیوٹن کی اٹھارہ کتابیں پڑھی ہیں اور
زمان و مکان سے متعلق اُس نے جو کچھ لکھا ہے وہ علامہ عراقی
کے رسالہ "غایۃ البیان" سے ماخوذ ہے"۔ ممکن ہے اس میں
مبالغہ ہو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ علامہ اقبال نے علامہ کشمیری سے
استفادہ کیا ہے اور علامہ کشمیری نے انہیں شیخ تاج الدین کا
ایک فارسی رسالہ مرحمت فرمایا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنے انگریزی

---

۱؎ خطوط اقبال [illegible]

A plea for deeper study to Muslim Scientists.

خطبات میں اس رسالے کے (عراقی کے نام سے) حوالے بھی دیے ہیں
اور یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ علامہ انور شاہ
کشمیری جدید سائنسی علوم اور ہیئت وغیرہ پر بھی وسیع نظر
رکھتے تھے۔ اسی طرح زیر تبصرہ کتاب میں علامہ کشمیری کے ادبی
کمالات بالخصوص عربی صرف و نحو اور علم بیان و بلاغت ـــ
پر ان کی گہری اور وسیع و عمیق نظر ہے جس پر [illegible] اٹھایا ہے اور
یہ عبارات پڑھ کر آج بھی علامہ کشمیری کے علم و فضل کا دبدبہ
محسوس ہوتا ہے۔ جب کسی معاصر کی روایت نقل کرتے ہیں جو علامہ
کشمیری کے بارے میں ہوتی ہے تو موضوع کے حدود کا لحاظ
رکھے بغیر دیگر اصحاب علم کے آراء و اقوال بھی درج کرتے ہیں
اس سے موضوع میں اگرچہ تسلسل باقی نہیں رہتا مگر بہت سی
تاریخی باتیں سامنے آتی ہیں جن کی وجہ سے علامہ کشمیری کی
تاریخی شخصیت کا مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کتاب کا
بڑا حصہ علامہ کشمیری کے عقیدہ ختم نبوت و قادیانیت سے تعلق رکھتا ہے علامہ
کشمیری کو اس فتنے نے کس قدر بے چین کر دیا تھا۔ اس کا
اندازہ [illegible] ملاقات [illegible] ہی سے ہو سکتا ہے۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے علامہ کشمیری کو گویا خاص طور پر قادیانیت
کے [illegible] الحاد جیسے کے لیے چن لیا تھا اس لیے
[illegible] مصنف نے اس رد قادیانیت کا ایک مستقل حصہ [illegible]
[illegible] جو ہمارا موضوع [illegible] تاریخی حقیقت [illegible]

مولانا انوری کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ اُس زمانے میں، جب بہاولپور کی عدالت میں علامہ کشمیری کا بیان ہوا، اپنے استاذ کے معاونِ خصوصی تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :۔

''مولانا محمد صاحب انوری لائلپوری، حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز تلامذہ میں ہیں۔ شہرہ آفاق مقدمہ بہاولپور میں حضرت شاہ صاحبؒ دستِ راست اور وکیل کی حیثیت سے کام کیا۔[۱]

یہ بیان علامہ کشمیریؒ نے جسٹس محمد اکبر کے سامنے کئی دن دیا۔ اگرچہ ان ایام میں دوسرے کبار علماء جیسے مولانا غلام احمد گھوٹوی، مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا ابوالقاسم محمد حسین، مفتی محمد شفیع، پروفیسر نجم الدین نے بھی عدالت میں بیانات دئے مگر جج نے اپنے فیصلہ کی بنیاد ہی علامہ کشمیری کے بیان پر رکھی ہے۔[۲] علامہ کشمیری کا بیان البیان الازہر کے نام سے جامعہ عباسیہ بہاولپور کے ارباب نے دیگر بیانات کے ساتھ شائع کیا تھا مگر اس میں اجمال اور

---

[۱] سوانح مولانا عبد القادر رائے پوری، ص ۱۸۰ حاشیہ، مکتبہ اسلام لکھنؤ

[۲] ملاحظہ ہو فیصلہ مقدمہ بہاولپور، گیلانی پرنٹنگ پریس لاہور

اختصار واقع ہوا تھا۔[1] مولانا محمد انوری کی کتاب میں یہ بیان مکمل اور بعینہٖ منقول ہے۔ اس اعتبار سے گرانقدر اور معتمد ہے۔

۴۔ سیرت انور شاہ کشمیری: پروفیسر مولانا عبدالصمد صارم

پروفیسر عبدالصمد صارم، دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل عالم نیز علامہ کشمیری کے شاگرد ہیں۔ علامہ کشمیری کی محبت و عقیدت انہیں ورثہ میں ملی ہے اُن کے والد محترم قاضی ظہیر حسن ناظم سیوہاروی کشمیر کے ایک قدیم تذکرہ نگار ہیں۔ جن کی کتاب "نگارستان کشمیر" مشہور و مقبول ہے۔ پروفیسر صارم طویل عرصے سے عربی کے استاد کی حیثیت سے اورنٹل کالج لاہور سے وابستہ ہیں اس کے علاوہ اپنی علمی اور تحریری خدمات میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کیا ہے ان کی تصانیف میں "تنقیدات طٰہٰ حسین" بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی "الشعر الجاہلی" کے قابل اعتراض خیالات پر تنقید و تبصرے سے متعلق ہے۔ عربی میں ڈاکٹر صاحب کے افکار و خیالات پر تنقیدی کتب و مقالات موجود ہیں مگر اردو زبان میں اس کا فقدان تھا۔ صارم صاحب نے ایک طرف اردو داں طبقے کو طٰہٰ حسین کی ادبی موشگافیوں سے متعارف کیا اور ساتھ ہی اُس کے ذہنی اختراعات کا مدلل جواب دیئے

[1] ملفوظات علامہ انور شاہ (فرقہ قادیانی) جمال پرنٹنگ لاہور مضمون "البیان الازہر"

کی کوشش کی۔ ان کا ایک اور قابل ذکر کارنامہ ابن قتیبہ کی مشہور
کتاب "الشعر و الشعراء" کا اردو ترجمہ ہے۔ عربی زبان میں ان کا
ایک مختصر مگر نہایت قیمتی رسالہ "البشائر" ہے جس میں قدیم مذاہب
و ملل کی مذہبی کتابوں سے وہ بشارتیں جمع کی گئی ہیں جن میں
خاتم النبیین صلعم کے فاران کی چوٹیوں سے نمودار ہونے کے واضح اشارے
ملتے ہیں۔ اس رسالے پر مصر کے مشہور فاضل اور مفسر قرآن علامہ
طنطاوی جوہری کی تقریظ بھی ہے۔

"محدث کشمیری" پر یوسف عارف نے جو مختصر کتابچہ لکھا ہے
وہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے ایک طالب العلم
نے لکھا ہے اور علامہ کشمیری کا ایک قدیم تذکرہ ہے۔ اس میں علامہ
کشمیری کی حیات اور تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ البتہ
ضمناً اس میں کچھ تاریخی باتیں آگئی ہیں۔ مثلاً علامہ کشمیری کے
ایک رسالہ "سہم الغیب فی کبد اہل الریب" کا تعارف
پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے از تالیف گویا مسلسل
[illegible] لکھا۔ اسی طرح کتاب واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ
علامہ اقبال نے اپنے مشہور انگریزی خطبات میں علامہ
کشمیری سے کئی مسائل میں استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کے تعداد صفحات چھپن ہے اور پہلی بار ۱۹۶۱ء
میں لاہور مصور پریس سے شائع ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک

کتابچہ انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی پر بھی لکھا ہے۔

۷۔ حیاتِ انور: مولانا محمد ازہر شاہ قیصر

یہ اہم ترین کتاب علامہ انور شاہ کشمیری کے بڑے صاحبزادے مولانا حافظ محمد ازہر شاہ قیصر نے مرتب کی ہے علامہ کشمیری کی حیات اور کارناموں پر بحث و تحقیق کرنے والوں کے لئے دفعتہً العمر کے لحاظ سے یہ کتاب ہر طرح مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ طویل مدت گزرنے کی وجہ سے کتاب نایاب ہو گئی تھی۔ مرتب محترم نے کتاب کی اہمیت اور ضرورت محسوس کرکے چند اور تحقیقی مقالات اضافہ کرکے ۱۹۸۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر لایا۔ کتاب کے دونوں ایڈیشن راقم کے پیش نظر ہے۔

یہ کتاب تمہید بیطار رسالت مختصر مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اکثر علامہ کشمیری کے ممتاز شاگردوں کے قلم سے ہیں بعض مضامین خود مرتب کتاب مولانا ازہر صاحب نے لکھے ہیں جو علامہ کشمیری کے حالاتِ زندگی اور بعض علمی کمالات پر مشتمل ہیں اس مضمون کا بیشتر مواد مولانا محمد میاں رسالۃ تاریخ المحدث مدرسہ امینیہ دہلی کا ہی میں قائم ہے۔ جس کا ذہن صاحب

---

لہ ملاحظہ ہو علماءِ حق: مولانا محمد میاں میں علامہ کشمیری کا تذکرہ

نے بھی اعتراف کیا ہے کتاب کا صفحہ (۲۷ و ۳۵) پڑھنے سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ بالخصوص وہ حصہ جس میں شاہ صاحب کی سیاسی خدمات سے بحث کی گئی ہے آسانی کے ساتھ مولانا میاں صاحب کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے بیشتر معلومات "نفحۃ العنبر" سے ماخوذ ہیں۔ ہم بلا تامل یہ بات کہتے ہیں کہ علامہ کشمیری کے فرزند ہونے کی حیثیت سے جن معلومات کی ان سے توقع کی جاسکتی ہے وہ اس مضمون سے پوری نہیں ہوتی ہے بلکہ بعض باتیں ایسی لکھی گئی ہیں جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔

کتاب کا دوسرا مضمون، جو سب سے طویل بھی ہے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا ہے جو نوے صفحات میں پھیلا ہوا ہے یہ مضمون علامہ کشمیری کے جلالِ علم اور جمالِ حلم پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے بحر مولانا گیلانی جیسے محققِ جلیل کا قلم اور علمی تموّج! علامہ کشمیری کی علمی شان اور مجتہدانہ کمالات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ علمی مسائل پر گفتگو کے دوران انہوں نے علامہ کشمیری کی قرآن فہمی پر خاص طور سے بحث کی ہے اور انہی کی افادات روشنی میں معانی قرآن کی گہرائی اور گیرائی، قرآن مجید کے مقاصد اور تفسیر بالرائے کے حدود و قیود واضح فرمائے ہیں۔ اسی طرح حدیث اور درس حدیث میں علامہ کشمیری کے مختصات اور ممیزات، اصطلاحات حدیث میں اُن کے اضافات، جرح و تعدیل اور اسماء الرجال میں اُن کی تحقیق، ائمہ متقدمین کے

اقوال و آراء پر منصفانہ نقد و نظر وغیرہ مباحث کو بیان کیا ہے۔ آخر میں ایک تاریخی واقعہ ذکر کیا ہے۔ جس سے استاد اور شاگرد کی باہمی شفقت و عقیدت نمایاں ہوتی ہے۔ مولانا گیلانی کا قلم اس مضمون میں ایک جگہ نہیں جاسکا جس میں وہ مشہور رہیں مگر اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ علامہ کشمیری کی علمی جامعیت اور ربانی بصیرت سے خود بخود پردہ اٹھ گیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے انہیں علامہ کشمیری کی درسی خصوصیات ہی بیان کرتے تھے مگر اس میں ایک ہمہ گیر شخصیت کی ہمہ گیری اور آفاقیت کھل کر سامنے آئی ہے

دوسرا مضمون مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے لکھا ہے اس کا اکثر حصہ علامہ کشمیری کی سیرت و سوانح سے متعلق ہے اور کئی باتیں محل غور ہیں البتہ مضمون کا آخری حصہ نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔ اس میں علامہ کشمیری کی درسی خصوصیات ترتیب کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اگرچہ یہ گنے چنے ہی ہیں مگر ان کی روشنی میں علامہ انور شاہ کے مطبوعہ درسی تقاریر سے اس انقلاب کا مفصل نقشہ تیار کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے صدیوں بعد دینی مدارس کے طریقہ درس و تدریس میں پیدا کیا۔

تیسرا مبسوط مضمون مولانا محمد منظور نعمانی (ایڈیٹر الفرقان بریلی) کے قلم سے ہے۔ موصوف علامہ کشمیری کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون چند تاثرات اور مشاہدات کا مجموعہ ہے تاہم مولانا نے چند تاریخی باتیں بھی ذکر کی ہیں۔ مثلاً علامہ کشمیری اور

مولانا ظہیر احسن شوق رحمہ اللہ کے علمی تعلقات، فقہ حنفی کے بارے میں علامہ انور شاہ کشمیری کا اطمینان، مسلمانوں کیلئے انگریزی زبان کو حاصل کرنے کی ضرورت، فتنۂ قادیانیت سے علامہ کشمیری کی بے چینی وغیرہ ان عنوانات کے تحت مولانا منظور صاحب نے جو باتیں قلمبند کی ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ البتہ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ علامہ ظہیر احسن شوق نیموی اپنی جلیل القدر تصنیف "آثار السنن" کے نظر ثانی اور ترمیم و اضافات کیلئے شیخ الہند کے ایما پر علامہ کشمیری کے پاس اُن کے گھر بھیجتے تھے (ملخصاً) مگر تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے جس زمانے میں آثار السنن شائع ہوئی اُس وقت علامہ کشمیری مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس تھے۔ اور طویل عرصے سے کشمیر سے دور تھے۔ "آثار السنن" سنہ ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوئی[1] اور محدث کشمیری ۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۰ھ کو تقریباً دس سال کے بعد کشمیر لوٹے۔ کتاب مذکور کا مطالعہ اور تصحیح ایک تاریخی حقیقت[2] ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ کام مدرسہ امینیہ کی صدر مدرسی کے زمانے میں ہی شروع ہوا ہے اور مکمل بھی)۔ دوسری بات جو مولانا نعمانی نے نقل کی ہے ... ہے کہ ایک عالم علامہ کشمیری کی وسعتِ نظر

---

۱۔ آثار السنن: مولانا محمد بن علی المعروف ظہیر احسن شوق نیموی، احسن المطابع پٹنہ سنہ ۱۳۱۹

۲۔ نیل الفرقدین ص ۵۶

کے قائل تو تھے مگر اُن کی دقتِ نظر تسلیم کرنے میں تامل تھا مولانا نعمانی زبان کی سخت تردید کی ہے مولانا نے ان کا نام تو نہیں لیا ہے البتہ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ایسی ہی بات مولانا محمد علی جوہر رح سے نقل کی ہے یعنی مولانا محمد علی مرحوم و مغفور محدث کشمیری کے علم و فضل کے قائل تو ضرور تھے مگر ان کا علم ان کے فہم پر غالب سمجھتے تھے[۳] بہر حال یہ ماننے کس بزرگ کی تھی ... ضروری نہیں کہ اس سے سا تھ اتفاق کیا جائے۔ ہم علامہ کشمیری کے "امالی" اور تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کی عقل "ادب خوردہ دل" تھی اور ان کے جذبات بے لگام نہیں تھے۔ ان کی واحد پونجی قرآن اور سنت کی خدمت تھی۔ وہ کسی بھی ایسی مصلحت کو قبول کرنے کیلئے تیار نظر نہیں آتے ہیں جو قرآنی تعلیمات اور اسلامی روح کے منافی ہو۔

حضرت سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا مقالہ بھی اُن کے مشاہدات کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر علامہ کشمیری کی سیرت و شمائل پر مشتمل ہے البتہ علامہ اقبال اور علامہ کشمیری کے تعلقات سے متعلق جو واقعات زیب قرطاس کیئے ہیں۔ وہ بہت ہی اہم اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج تک علامہ کشمیری اور ڈاکٹر اقبال کے تعلق پر جس کسی اہل علم نے قلم اٹھایا اُس نے بھی زیادہ اسی مضمون

---

[۳] حکیم الامت نقوش و تاثرات، ص ۱۱، مطبع معارف اعظم گڈھ

مضمون سے خوشہ چینی کی ہے۔ پاکستان کے مرفوع القلم حضرات نے بھی زیادہ تر مولانا اکبرآبادی کے مضمون ہی کا حوالہ دیا ہے۔

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا ایک اور مختصر مضمون بھی حیاتِ انور کے طبع ثانی میں شامل کیا گیا ہے یہ مضمون دراصل علامہ کشمیری کے ایک جامع و مانع ملفوظ کی تشریح و تفصیل ہے ملفوظ کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری جیسے راسخ العقیدہ عالم دین نے ایک بار فرمایا کہ فلسفہ جدید ہی اسلام سے قریب ہے نہ کہ قدیم یونانی فلسفہ۔ اس ملفوظ پر جو علامہ کشمیری کی وسعت علمی اور دقتِ نظر کا بہترین ثبوت ہے، مولانا عبد الماجد دریابادی نے بھی وسیع الفاظ میں تبصرہ کیا تھا۔[1]

کتاب کا آٹھواں مقالہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رح کا ہے اس میں علامہ کشمیری کی چوبیں تصانیف، چار امالی (وہ درسی تقاریر جو ان کے شاگردوں نے جمع کئے) ایک حاشیہ (جو موجود الاسم اور مفقود الجسم ہے) اور ایک مجموعہ یادداشت یعنی "مشکلات القرآن" کا تعارف پیش کیا ہے۔ یہ مضمون نفحۃ العنبر" سے زیادہ محیط ہے۔

کتاب کے دلچسپ اور حکیمانہ مضامین میں جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب کا مضمون "نور انور تنور امت" قابلِ قدر

---

[1] صدق جدید، لکھنؤ ۲۹ جنوری ۱۹۶۰ء

اور بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ یہ مضمون چالیس صفحات پر مشتمل ہے اس میں شاہ صاحب کی سیرت و سوانح، علم و فضل اور تقویٰ و طہارت سے متعلق مختلف واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ مولانا طیب صاحب کسی زمانے میں طویل عرصے تک صاحب البیت کی حیثیت رکھتے تھے اسلئے ان واقعات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی ہے۔ اس میں علامہ کشمیری کے ورودِ دیوبند کا واقعہ، قیامِ دیوبند، درس و تدریس، نکاح، طبیعت و مزاج، علمی جامعیت، درسی خصوصیات، کثرتِ مطالعہ، حنفی مسلک کی تائید، معیارِ تنقید و تبصرہ، حافظہ اور استحضار، تقویٰ، اخلاص اور توکل، غرض شاہ صاحب کے سارے اوصافِ حمیدہ حکیمانہ اسلوبِ بیان میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ ہاں ایک[۱] جگہ علامہ کشمیری کے مصر جانے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر افسوس ہے ہمیں علامہ کشمیری کے مصر تشریف لے جانے کی تائید کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے نہیں ہوئی۔

مولانا محمد میاں صاحب کا مضمون علامہ کشمیری اور دار العلوم دیوبند کے ساتھ اُن کے علمی اور جسمانی تعلقات سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اپنے موضوع سے ہٹ کر انہوں نے اُن کے علمی کمالات اور درسی خصوصیات سے بحث کی ہے دار العلوم

---

[۱] حیاتِ انور، طبع دوم۔ ص ۲۵۴

سے علامہ کشمیری کے متعفی ہونے کا واقعہ انہوں نے بھی الفاظ کے الٹ پھیر میں گم کیا ہے جس سے یقیناً اس تلخ حقیقت کی بُو آتی ہے۔ کہ اس حادثے میں مولانا مرحوم کا میلان حزب اختلاف کی طرف رہا ہے۔ چنانچہ مرتب کتاب مولانا انظر صاحب نے بھی یہاں حاشیہ بڑھا کر جہاں ہے گمان کو یقین میں بدل دیا ہے۔

معلومات افزا مضامین میں مولانا محمد انوری لائلپوری کا مبسوط مضمون بھی ہے جو درحقیقت اُن کی کتاب "انوار انوری" کا طویل اقتباس ہے۔ ہم نے اس کتاب پر الگ تبصرہ لکھا ہے۔

"حیات انور" میں تین اور بسیط مضامین ہیں۔ جن میں مولانا سعید احمد چشتی، مولانا محمود احمد نانوتوی صدیقی اور مولوی شمس تبریز خان کے مضامین زیادہ مبسوط ہیں۔ مولانا چشتی کے فاضلانہ مقالے کا تعارف ہم مقالات کے باب میں کریں گے۔ مولانا نانوتوی علامہ کشمیری کے بہت پرانے اور قابل ترین شاگردوں میں سے ہیں۔ اُن کا مضمون عقیدت و محبت سے لبریز ہے۔ علامہ کشمیری کی درسی خصوصیات میں اُنکی جرح و تعدیل اور رجالی تحقیق سے خاص طور سے تعرض کیا ہے۔ اپنے دعویٰ کی تائید میں انہوں نے اپنے استاد کے زمانہ درسی تقاریر کے اہم اقتباسات اور اشعار نوٹ کر کے دیے

غرض حیات انور بڑی جامع کتاب ہے۔ اس میں صاحب سوانح کی حیات، شکل و شمائل اور علمی کارناموں پر قیمتی مواد موجود ہے مگر مرتب نے اس کی تصحیح اور نظر ثانی کیطرف کوئی توجہ نہ دی ہے۔ پہلے ایڈیشن میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں وہ موجودہ ایڈیشن میں بھی بعینہٖ منتقل ہو گئی ہیں۔ اس پر نئی طباعت و کتابت کی غلطیاں مستزاد۔ کئی جگہوں پر پوری پوری عبارت ہی حذف ہو گئی ہے جس سے مفہوم اور عبارتوں میں بڑی بے ترتیبی پیدا ہو گئی ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر مرتب محترم نے اس ایڈیشن کو منظر عام پر لانے سے پہلے مضمون نگار حضرات کو اپنے مضامین پر نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کرنے کی درخواست کرتے۔ پچھلے بائیس[۲] سال سے ایک دنیا بدل گئی بہت سے مخفی حالات و واقعات منظر عام پر آ گئے اور بہت سی باتیں مسترد ہو گئیں۔ "حیات انور" میں راقم کا بھی ایک مختصر مضمون شامل ہے جس کا عنوان "علامہ انور شاہ کشمیری اور اقبال" ہے۔ یہ مضمون چار سال قبل ایک مقامی اخبار (سرینگر) میں شائع ہوا تھا جسے بعد میں "دار العلوم" میں شائع کیا گیا۔ اس مضمون میں بھی کئی ایسی باتیں لکھی گئی تھیں جو قابل اصلاح اور غور طلب

---

[۲] حیات انور کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

ہیں۔

(۵) مولانا انور شاہ کشمیری :۔ حیات اور کارنامے مصنفہ قاری محمد رضوان اللہ، استاد شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۲ء

قاری محمد رضوان اللہ علیگڈھ یونیورسٹی میں شعبہ دینیات کے لیکچرر ہیں [۱] مصنف محترم نے یہ کتاب ڈاکٹریٹ کے لئے لکھی تھی اور اس پر یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل بھی گئی ہے بعد میں یہ کتاب مسلم یونیورسٹی ہی سے شائع ہوگئی مگر ہماری رائے میں کتاب کی اشاعت میں بڑی عجلت سے کام لیا گیا ہے۔ موصوف کو اس کتاب پر پانچسو روپیہ کا انعام بھی مل چکا ہے۔

یہ کتاب، جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے دو حصوں میں منقسم ہے!
(۱) مولانا انور شاہ کشمیری کی حیات (۲) شاہ صاحب کے کارنامے۔

جہاں تک حصہ اول کا تعلق ہے، ہماری رائے میں شاہ صاحب کے حالات زندگی اس میں پہلی بار مرتب صورت میں پیش کئے گئے ہیں اس سے پہلے اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مجمل بھی تھا، اور اس میں بے ترتیبی اور عدم انضباط بھی پایا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب کے سلسلہ سیادت اور

---

[۱] رسالہ نور الایمان (اردو ترجمہ) میں تین جگہ صدر شعبہ لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے مطبوعہ مبارکپور ۱۹۷۲ء

اور حادثۂ استعفیٰ (۱۹۲۷ء) کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔ شاہ صاحب کے سید ہونے کے بارے میں جن حضرات کو غلط فہمی تھی، قاری صاحب نے اُسے مستند معلومات کی روشنی میں رفع کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح شاہ صاحب کے دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے اور مدرسۂ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) کی طرف مراجعت کرنے کا واقعہ اگرچہ مشہور ہے مگر کسی بھی تذکرہ میں اس حادثہ کے صحیح حالات نہیں ملتے تھے۔ بلکہ ہر ایک اسے (مولانا بنوری کو مستثنیٰ کرکے) مشاجرات صحابہ پر محمول کرکے کف لسانی کی لبیل کے نیچے رکھتا تھا قاری صاحب نے اس تاریخی واقعہ کی تحقیق کرکے اُس وقت کے دو مشہور جرائد "الضابۃ" اور "مہاجر" سے معلومات اکٹھے کئے ہیں اور اس تاریخی واقعہ کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے مگر اس کے باوجود اس حصے میں بکثرت غلطیاں رہ گئی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف تصنیف و تالیف میں سفیر ذہنہ دار واقع ہوا ہے مصنف اس کتاب کی تصنیف کے دوران کشمیر بھی آئے ہیں مگر اس کے باوجود نہ اسماء اماکن درست لکھے ہیں اور نہ اشخاص کے۔ حضرت شیخ حمزہ مخدوم کو "مخدوم شاہ" مسجد مدین صاحب کیلئے "مسجد مدنی" حضرت شیخ سید احمد کرمانی کیلئے "شاہ کرمان ابو الفیاض" وغیرہ لکھے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی تاریخ

---

لہ رضوان اللہ، ص ۳۵ ۔ ۲ہ ایضاً

یا قابل اعتماد اہل علم کو چھوڑ کر جاہل عورتوں سے معلومات اخذ کیے گئے ہیں
اسی طرح "فیض عام" مدرسہ کے بارے میں قاری صاحب نے لکھا ہے
کہ شاہ صاحب نے یہ مدرسہ اُس وقت قایم کیا جب مدرسہ امینیہ سے علیحدہ
ہو کر کشمیر وارد ہوئے اور پھر چند سال بعد حج کرنے تشریف لے گئے۔[1]
مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ مدرسہ شاہ صاحب نے حج بیت اللہ سے واپس آ کر
قائم کیا۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اسی طرح
قاری صاحب نے دعویٰ کیا ہے "شاہ صاحب نے حج سے مشرف ہو کر طرابلس
بصرہ، شام اور مصر کا بھی سفر اختیار کیا ہے"۔ یہ بھی تحقیق طلب ہے۔
کتاب میں ماخذ کا حوالہ اس کثرت سے غلط دیا ہے کہ کتاب پر کوئی اعتبار
نہیں رہتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جب شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۴۶ء
میں کشمیر چھوڑ نعرہ بلند کیا تو گاندھی جی نے اس کی حمایت میں بیان
دیا۔[2] پھر گاندھی جی کے اس بیان کا حوالہ مُلا عبدالقادر بدایونی
کی "منتخب التواریخ" کا دیا ہے۔[3] اسی طرح پروفیسر محب الحسن کی
مقبول انگریزی کتاب کا مصنف نے کئی جگہ حوالہ دیا ہے مگر کہیں بھی
کتاب کا اصلی نام " KASHMIR UNDER THE SULTANS
(کشمیر سلاطین کے عہد میں) نہیں لکھے قاری رضوان صاحب " SULTAN
UNDER THE KASHMIR" (سلطان زیر کشمیر) رقم فرماتے
ہیں۔ جہاں کتابیات کی فہرست دی ہے وہاں بھی اسی طرح غلط

---

[1] رضوان اللہ: ص ۳۶ حاشیہ [2] ایضاً [3] ص ۳۶ حاشیہ [4] ص ۴۵

نام لکھا ہے۔ کتاب کا اکثر مواد اردو اخبارات و رسائل اور حیاتِ انور سے ماخوذ ہے مگر وہ ان کا حوالہ دینے سے شرماتے ہیں اور خواہ مخواہ عربی کتابوں کا غلط سلط حوالہ دیا ہے۔ صفحہ ۲۴ پر مولانا مشیت اللہ بجنوری کا ایک قول نقل کر کے نفحۃ العنبر کا حوالہ دیا ہے حالانکہ اس کتاب میں اس قول کا وجود ہی نہیں ہے۔ دو سطور پر مشتمل یہ قول "حیات انور (طبع دوم صفحہ ۲۷۴) سے من و عن نقل کیا گیا ہے۔ بعض جگہوں پر معلومات کا حوالہ بھی نہ دیا ہے اور بڑے ہی غیر ذمہ دارانہ جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم ایسے چند مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ مصنف نے یہ معلومات کہاں سے اخذ کئے ہیں۔

(۱) صفحہ ۲۱ کے آخری تین سطور اور صفحہ بائیس[۲۲] کے نو[۹] سطور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے مضمون سے ماخوذ ہیں۔ یہ جملہ بارہ[۱۲] سطور حیات انور طبع دوم صفحہ ۱۸۸-۱۸۹ میں لفظ بلفظ موجود ہیں۔

(۲) صفحہ ۲۹ کی آخری اور صفحہ ۳۰ کے ابتدائی دو سطور "معارف" اعظم گڑھ نومبر ۱۹۶۷ء سے منقول ہیں یہ مضمون حیات انور میں بھی شائع ہوا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۵ سطر ۱۱ تا ۱۵۔

(۳) صفحہ ۳۰ سطر ۵ تا ۱۸ "معارف" کے مقالہ ہی سے ماخوذ ہیں، ملاحظہ ہو حیات الانور ص ۷ تا ۱۸۔

(۴) صفحہ ۳۴ میں پہلا حوالہ فیض الباری علی صحیح البخاری کا دیا گیا ہے جو غلط ہے یہ مواد مولانا محمد میاں کے مقالے سے نقل کیا گیا ہے۔ مولانا محمد میاں کا مقالہ حیات الا[illegible]

بھی شامل ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مولانا انور شاہ صاحب کے کارناموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اولاً اُن کی خدمات حدیث پر گفتگو ملتی ہے اور اصطلاحات حدیث پر اُن کے اضافات، رجال کی تحقیق اور چند احادیث کی تشریح لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد علم تفسیر میں شاہ صاحب کے مقام سے متعارف کیا گیا ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ عقیدہ ختم نبوت، مسئلہ ناسخ و منسوخ، حقیقت یاجوج ماجوج اور عقیدہ رفع و نزول مسیح علیہ السلام پر بحث کی گئی ہے۔ پھر فقہ کی طرف آئے ہیں اور اس میں تمام مسائل مثلاً مسئلہ تکفیر، تحقیق اذان وغیرہ مسائل مولانا انور شاہ صاحب کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں شاہ صاحب کی تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے جو تقریباً ۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس حصے کا سارا مواد چند اردو رسائل اور کتب سے لیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصنف نے اصلی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اندھا دھند عربی کتابوں کی فہرست مرتب کی ہے جن میں متعلقہ مباحث کا وجود ہی نہیں ہے۔ حدیث کے باب میں مصنف نے جو رجالی تحقیق پیش کی ہے اور جس کا حوالہ دو مصنفات "العرف الشذی" اور "فیض الباری" سے دیا ہے، اصل میں مولانا محمود احمد نانوتوی صاحب کی ایک مسودہ مضمون سے لفظ لفظ اور حرف بحرف منقول ہے۔ مصنف نے "العرف الشذی" کا ہر جگہ حوالہ دیا ہے مگر آپ کتاب سے ملا کر مصنف کے حوالہ جات دیکھیے وہاں ایک جگہ بھی نہ ملے گا۔

ختم نبوت کے مسئلے پر مصنف نے تقریباً ۸۰ صفحات سیاہ کیے ہیں مگر جس کے سامنے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ "ختم النبوة" ہوگا وہ خود بخود تسلیم

کرے گا کہ اس مصنف کے سارے معلومات اصل عبارت کو توڑ مروڑ کر درجِ کتاب کئے گئے ہیں۔

مسئلہ ناسخ و منسوخ پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی "فہم قرآن"[1] سے من و عن نقل کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مولانا اکبر آبادی صاحب نے اس فاضلانہ بحث میں جو امثال و نظائر پیش کئے ہیں۔ مصنف نے انہیں بھی اُچک لیا ہے۔ ناسخ و منسوخ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماخذ "قصص القرآن" اور "قاموس القرآن" ہے۔ سب سے قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ اس خالص تاریخی موضوع کی تحقیق کرنے کے لئے قاری رضوان اللہ صاحب مشورہ دیتے ہیں کہ "اخبار الاخیار" "قصائدِ غزنوی" "الانسان الکامل" "حکمۃ الاشراق" "شرح المواھب" کا مطالعہ کیا جائے۔ یہی حال کتاب کے دیگر مباحث کا بھی ہے۔

اس انتہائی سرقاتِ عبارت کے علاوہ کتاب میں اتنی فاش غلطیاں ہیں۔ کہ پیشانی شرم سے عرق ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات نقل بھی اچھی طرح نہ کر پائے ہیں۔ ممکن ہے ان میں کاتب کی غلطیاں بھی ہوں مگر ہر جگہ کاتب کو ذمہ دار ٹھہرانا بہت مشکل ہے۔ صفحہ ۱۰ میں لکھتے ہیں۔ "یہ حدیث زیلعی نے ابن کامل سے تخریج کی ہے"۔ حالانکہ اصل ماخذ میں "ابن عدی کی الکامل" صحیح اور درست الفاظ میں موجود ہے۔ مصنف کے ہاں "الملل والنحل" ضرور علامہ ابن حزم کی تصنیف ہے مگر "المحلی" "المجلی" اور "الاحکام فی اصول الاحکام" ابن خرطوم نام کے کسی عالم کی ہے۔ یہاں تک کہ فہرست ماخذ میں بھی ابن حزم و ابن خرطوم دو مصنفین کی حیثیت سے درج کئے ہیں۔

---

[1] فہم قرآن، ندوۃ المصنفین دہلی: ص ۴۲ تا ۵۵

حالانکہ یہ تینوں کتابیں محدث ابن حزم ظاہری ہی کی ہیں۔ ڈارون نے ان کے اسلاف بندر قرار دیئے اور قاری رضوان صاحب نے حافظ ابن حزم کے والد کو ہی لکھا، کمال کا ارتقاء ہے، مگر معکوس..... مولانا انور شاہ صاحب کے رسالہ "مرقاۃ الطارم" کا تعارف پیش کرتے ہوئے علامہ مصطفیٰ المراغی کے یہ الفاظ ذکر کیے ہیں "ورأیت افضل تعذیۃ الوثیقۃ علی هذا الکتاب" اور حوالہ دو کتابوں کا دیا ہے، (۱) "موقف العقل والعلم" (۲) مقالہ ڈی لیٹ (جو قاری رضوان صاحب کی زیر تبصرہ کتاب کے سوا ایک اور نام رکھا ہے) مگر راقم کو پہلے ماخذ یعنی موقف العقل میں ان الفاظ کا وجود بھی نہیں ملا ہے، یہ مقالہ ڈی لیٹ سے ہمارا اعتماد بھی اٹھ گیا۔ اصل میں قاری رضوان صاحب نے یہ الفاظ حیات انور سے لئے ہیں۔ اس کتاب میں مولانا محمد یوسف بنوری نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ جب یہ رسالہ مصر میں علامہ مصطفیٰ صبری کو دکھایا تو انہوں نے یہ مذکورہ بالا الفاظ بطور مصنف کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات پر ہے کہ مولانا بنوری واضح الفاظ میں مصطفیٰ صبری لکھتے ہیں مگر قاری صاحب آنکھیں بند کر کے مصطفیٰ المراغی لکھتے ہیں۔ جو ایک دوسرے عالم تھے اور جنہوں نے "موقف العقل" کے نام سے کوئی کتاب ہی نہیں لکھی ہے۔

علامہ صبری شیخ الاسلام دولت عثمانیہ اور علامہ مراغی شیخ الازہر تھے۔

مولانا انور شاہ کے اشعار کی تعداد ایک جگہ "پندرہ ہزار سے زائد" (ص ۸۵) لکھا ہے، دوسری جگہ "گیارہ سو سے زائد" (ص س) اور تیسری جگہ "پندرہ سو" (ص ۲۵) تحریر فرمایا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ان متضاد اور بے بنیاد "معلومات" کا حوالہ بھی اپنی ڈی لیٹ (یاد رہے مصنف نے بھی اپنے مقالے کو ڈی۔ لٹ نام ہی سے لکھا ہے) سے دیتے ہیں۔ اللہ پاک ہی بہتر جانتا ہے کہ مصنف نے اس مقالہ

میں بھی کیا کیا طوفان بپا کیا ہوگا۔ شاہ صاحب کے منظوم عربی رسالہ "ضرب الخاتم" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں اشعار کی مجموعی تعداد چار سو ہے۔ مگر یہ بھی بالکل غلط ہے۔ یہ رسالہ فقط دو سو پچاس (۲۵۰) اشعار پر مشتمل ہے۔

مصنف نے شاہ صاحب کی شاعری کے بارے میں صرف چند صفحات لکھے ہیں مگر حوالہ جات کی غلطیاں یہاں بھی نمایاں ہیں اور اشعار مسخ کر کے پیش کئے گئے ہیں۔

عربی زبان و ادب، علم تصوف، فلسفہ و کلام، تفقہ فی الدین، حدیث و تفسیر میں مولانا انور شاہ کی جدت اور ابتکار جیسے اہم مضامین سے کتاب خالی ہے۔ علامہ انور شاہ کا فضل و کمال انہی مضامین کو زیر بحث لانے سے نمایاں ہو سکتا ہے۔

۶۔ سیرت انور: مسعود احمد قاسمی[۱]

کتابچہ دیو بند سے شائع ہوا اور اکثر مواد "حیات انور" سے لیا ہے چند باتیں رسالہ "دارالعلوم" کے مختلف پرچوں سے لی گئی ہیں۔ اس پر تبصرہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ الانور: مسٹر عبدالرحمان کوندو: شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

یہ کتاب حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ کتاب سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے کئی اخبارات و رسائل میں اس پر تبصرے شائع ہوئے انہیں "معارف" اعظم گڑھ جنوری ۱۹۷۸ء "برہان" دہلی ستمبر ۱۹۷۷ء اور روزنامہ "آفتاب" سری نگر ۱۵ و ۱۶ نومبر ۱۹۷۷ء کے تبصرے قابل ذکر ہیں۔ کتاب کا خاص موضوع اگرچہ تو ہے اور اس لحاظ سے تبصرہ لکھنا پریشان کن ہے

---

[۱] ادارہ ہادی دیو بند، یو۔ پی

تاہم اس کو چار حصوں میں تقسیم کرنا آسان ہے۔

۱۔ حصۂ اول، اس کا تعلق علامہ کشمیری کے حیات کے ساتھ ہے از صفحہ ۲۹ تا ۲۴۴

۲۔ حصۂ دوم، شاہ صاحب کے شاگردوں کے تاثرات۔ از صفحہ ۲۴۳ تا ۵۱۱

۳۔ حصہ سیوم، علامہ انور شاہ کشمیری اور انکے معاصرین۔ از صفحہ ۵۲۷ تا ۶۴۱

۴۔ حصۂ چہارم، اس میں علامہ کشمیری کا ایک قصیدہ، اُن کے چند متعلقین کے رثار اور تین تتمات۔ از صفحہ ۶۴۱ تا ۷۱۷

اب ہم ان چار حصوں کا علیحدہ علیحدہ تعارف کرائیں گے۔

**حصۂ اوّل :۔** یہ حصہ ۲۲۲ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اس میں لولاب اور لولاب کے مضافات کا جغرافیہ اور علامہ کشمیری کے زمانے میں کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شخصیت کی تعمیر میں اُس کے مولد و منشار کے مختلف سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا ایک خاص حصہ ہوتا ہے اسلئے ان کا مطالعہ کرنا اور علت و معلول کے اصول پر نتائج و اثرات کی نشاندہی کرنا ضروری ہے مگر ان حالات کو اگر داستانوں اور قصص کے طور پر جمع کیا جائے تو یہ الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ بن سکتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں علامہ کشمیری کے مقسط الراس کا محل وقوع، آب ہوا اور عرض بلد و طول بلد دکھانے پر دلیوں اوراق سیاہ کئے گئے ہیں۔ بلکہ نزورہ والوں کو خوش ہونا چاہئیے کہ اس کتاب میں اس مقام کا "گرہ شبیر" ہی نیاد ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اگر علامہ کشمیری کی سوانح حیات لکھی جارہی ہے تو علامہ اقبال کی نظم "آرزو"، مولانا حالی کی "سیر کشمیر" مولانا شبلی کے قصیدۂ "کشمیریہ" اور حفیظ جالندھری کی منظر کشمیر جیسی

طویل طویل نظمیں کتاب میں شامل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اسی طرح علامہ کشمیری کے والدین کے ناموں کی لغوی تحقیق کر کے بال کی کھال نکالنا کچھ کم حیرت انگیز؛ پریشان کن نہیں ہے۔ ہزارہ میں شاہ صاحب کی تعلیم پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ قدرے اہم ہے مگر عبارت آرائی اور بے جا لفاظی نے یہاں بھی حقائق پر تہ بہ تہہ گرد چڑھا دی ہے۔ اسی کے ساتھ علامہ کشمیری کے حادثۂ مفارقت دیوبند کو پیش نہیں کیا گیا اور اپنی عدم واقفیت پر کف لسانی کی غلاف چڑھائی ہے۔ مرتب صاحب لکھتے ہیں۔

"حضرت شاہ صاحب اور اکابرین دیوبند کے مابین واقع شدہ اختلافات اور مشاجرات کی کسی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ان واقعات سے متعلق خود شاہ صاحب کا عمل یہ تھا کہ آپ اس واقعہ سے چار پانچ سال زندہ رہے مگر کبھی بھولے سے بھی ان واقعات کا تذکرہ زبان پر نہ لاتے تھے" ص: ۱۹۔ مگر یہ صریح غلط ہے ہم نے نفحۃ العنبر پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا بنوری کا یہ قول نقل کیا کہ یہی حادثۂ عظمیٰ ان کی موت کا باعث بنا۔ اس حادثے کو "اختلاف امتی رحمۃ" کی عینک سے دیکھنا مرتب کی منطق ہے۔ اس سے اُس وقت سارے ہند میں ایک ہلچل پیدا ہوئی۔ اخبارات میں رنج و افسوس کے بیانات شائع ہوئے تھے۔ اگر مرتب کے سامنے ۱۹۲۷ء کی "معارف" کی فائل موجود ہے تو وہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے شذرات مطالعہ فرمائیں۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا نظام شمسی اُسی وقت تتر بتر ہوا جب دارالعلوم کا تیرہ سال کا عظیم الشان خادم اور جانشین شیخ الہند ایک بڑی مقدس جماعت کے قافلے کے ساتھ دارالعلوم سے احتجاجاً نکلا اور وہ بھی اس طرح کہ بہ باطن اور ضمیر فروش (چند مخلص

مخالفین کو مستثنیٰ کر کے) کی جرأت و جسارت اور دریدہ دہنی سے دل چھلنی ہو گیا تھا۔ اور بزبانِ حال کہہ رہا تھا ؎

وهل من كسير البال اذا ادهرلهٗ
لقاءك الا بالدموع السوائل (علامہ کشمیری)

(ہے کوئی ایسا دل شکستہ جس کو زمانے نے صدمہ پہنچایا جو آنسو بہائے بغیر تجھ سے ملے)

یہ دعویٰ کرنا کہ شاہ صاحب بعد میں بھولے سے بھی اس کا اظہار نہ کرتے تھے، غلط ہے۔ مولانا احمد رضا بجنوری لکھتے ہیں کہ ایک بار شاہ صاحب نے ڈابھیل (گجرات) میں فرمایا: "اس زمانہ میں کلمہ حق کہنا بہت مشکل ہو گیا ہے ہم نے صرف ایک کلمہ حق کہا تھا اور اس کی وجہ سے آج آٹھ سو میل دور پھینک دئیے گئے۔"[1]

سوانح کے اس حصے کا بنیادی ماخذ محمد انور شاہ قیصر کی کتاب "حیاتِ انور" ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ کتاب ہی چند تصرفات اور اضافات کے ساتھ حیاتِ انور ہی کا ایک ری ایڈیشن ہے۔ ہم اس کے چند صفحات کی نشاندہی کرتے ہیں جو قارئین کرام حیاتِ انور دوسرے ایڈیشن میں پا سکتے ہیں۔

الانور: صفحہ ۹۴-۹۵، ۹۷، ۱۰۸-۱۱۲، ۱۵۷-۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۸-۱۷۰-۱۷۷ تا ۱۸۴، ۱۹۱-۱۹۳، ۲۱۲-۲۱۴، ۲۱۶-۲۱۹، ملاحظہ ہو حیاتِ انور (انور شاہ) کے صفحات بالترتیب ۲۷۴-۲۷۵، ۲۷۶، ۳۱۳ (حصہ دوم) ۳۰۶+۳۰۴، تا ۳۰۵، ۲۳۲ تا ۲۳۴، ۱۵۸-۱۵۹، ۲۳۴-۲۳۵+۱۳۴، ۲۸۳-۲۹۰، ۲۸۲+ ۱۹۲-۱۹۳ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر حوالہ جات ایسے ہیں کہ مرتب محترم نے ان کا حوالہ بھی ساتھ ساتھ دیا ہے ہمیں صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ حصہ اول جس میں مرتب کی کاوش بھی شامل ہے مگر اس کے باوجود کس قدر حیات انور ہی سے ماخوذ ہے اور آگے کی ساری کتاب کہنا چاہئے حیاتِ انور ہی ہے۔ مگر ایک انتہائی

[1] انوار الباری ج ۲ قسط ۶ ص ۱۱

بغیر ذمہ داری، جو مرتب سے سرزد ہوتی ہے یہ ہے کہ بہت سے مقامات
پر اپنے ماخذ کا نام ہی نہیں لیتے ہیں۔ صفحہ ۱۵۷ کے حاشیہ پر انہوں نے معمر چشتی
کے بارے میں ایک عربی اقتباس نقل کیا ہے۔ اور ماخذ درج نہیں کیا ہے یہاں
یہ اقتباس حیات الورز (طبع دوم، صفحہ ۱۲۶) پر ملتا ہے اسی طرح صفحہ ۲۰۵ پر
جو عربی اقتباس اور اس کا ترجمہ درج کیا ہے (وہ حیاتِ الورز صفحہ ۱۲۰) سے لفظ بلفظ
نقل کیا گیا ہے۔ ماخذ حذف کئے ہیں چند اور بغیر حوالہ مضامین وہ ہیں جن کے عنوانات درج
ذیل لکھے گئے ہیں۔

(۱) لیفٹیننٹ [illegible] صاحب؟: الاورز: صفحہ ۱۴۹ (۲) اولاد گنا ایک ادنا:
صفحہ ۲۳۸ (۳) طارشہ اور نو [illegible] کی تاریخی اہمیت صفحہ ۵۲ (۴) کچھ نامعلوم
حوالے: صفحہ ۹۲ (۵) [illegible]: صفحہ ۴۹ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب
اگرچہ سادہ عبارت آرائی کا بہترین مرقع ہے مگر اس حصے میں یہ خصوصیت
حد سے زیادہ [illegible] دکھائی دیتی ہے اور مبالغہ آمیزی اور جذباتیت نے کتاب کے بعض
حصوں سے بہت سی تاریخی باتیں مسخ اور محرف ہو گئی ہیں۔ ہم دو مثالوں
پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) مرتب نے مکتبۂ فیضِ عام پر بہت کچھ لکھا ہے، ہمارے نزدیک اس کی
تاریخی حیثیت بس اتنی تھی کہ جب شاہ صاحب [illegible] کے بعد کشمیر گئے تو بارہ مولہ میں
ایک مدرسہ قائم کیا جس کے پیچھے خواجہ عبدالصمد ککرو کا اصرار بھی کار فرما تھا۔
صاحب نے تین سال سے کم عرصہ تک پہلے دینی تعلیم دی، حنفی مسلک کی آبیاری خاص
طور پر پیشِ نظر تھا، ان کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:
"فقیر حقیر در قصبہ بارہ مولہ از کشمیر بخیالِ خود لغرض اشاعت علم دینی واعانت

مذہب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ طرح تعلیم فقہ [illegible] ہو گئی۔
مگر مدرسہ تین سال سے کم مدت تک باقی رہا اور شاہ صاحب کے لیے دیوبند آنا مقدر
میں آیا۔ مگر ہمارے مرتب نے فیضِ عام کے وجہ تسمیہ کا تاریخی نام وغیرہ پورے ورق
سیاہ کرکے ایسی عبارت آرائی سے کام لیا ہے کہ علم بدیع کی کوئی کسر نہیں چھوڑی
دیکھیے، وہ اس مکتب کو علی گڑھ [illegible] دیوبند ہی نہیں بلکہ شاید بغداد کا
نظامیہ اور الازہر کا جامعہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اس مدرسے کے ساتھ ایک سیاسی
تحریک وابستہ کرنا چاہتے ہیں اگر مرتب ایسا ہی سمجھتے ہیں تو اس کے ساتھ اتفاق کرنا ضروری
نہیں ہے اور نہ ہی رسالے میں نہ خود شاہ صاحب کے دل و دماغ میں بھی اس مدرسے سے
کسی تحریک کو متحرک کرنے کا خیال تھا۔ وہ ایک علمی آدمی تھے۔ اور کتابیں ان کا اوڑھنا
بچھونا تھا۔ کشمیر کے لوگوں میں بھی ان کی قدر اور عقیدت ان کے علم اور تقویٰ کے
بدولت تھی نہ کہ کسی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے۔ رہی یہ بات کہ مدرسہ کیوں
نہ چل سکا۔ اور شاہ صاحب کشمیر میں کیوں نہ ٹھہرے۔ مرتب نے اس کا ذمہ دار وقت
کے علماء اور سجادہ نشین حضرات کو ٹھہرایا ہے۔ ممکن ہے اس میں کچھ حقیقت بھی ہو
مگر یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شاہ صاحب بہت شروع سے جوارِ رسول میں دائمی
قیام کرنا چاہتے تھے۔ وہ عرصے سے دنیا و مافیہا سے دل برداشتہ ہو کر پردہ
خفا میں رہنا چاہتے تھے۔ گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا کی طرف ان کا رجحان بڑھتا جاتا تھا۔
ان کے اسی وقت کی ایک نظم کا ایک شعر پڑھنے کے قابل
ہے۔

سفر کی منزل ہے دارِ دنیا، ذرا تو اس کا خیال سا کر
سدا نہیں ہے یہ دیس بنرا، ضرور جانا ہے دن بِتا کر

جگہ فرماتے ہیں ۔

کبھی نکل کر تو جنگلوں میں خدا کی قدرت کا دیکھ جلوہ

کہیں ہے اونچا کہیں ہے نیچا ، کہیں اندھیرا ہے جگمگا کر (ذخیرۂ ادب
کشمیر نمبر ۴۸ لاہور) تعجب ہے کہ شاہ صاحب کے ارادۂ ہجرت کا باعث اہل
کشمیر کی بد معاملگی ٹھہراتے ہیں ، حالانکہ شاہ صاحب کا یہ خیال دیوبند میں بھی دور نہ ہوا
تب ہی تو دیوبند کے مدعیوں نے آخر ان کے پیروں میں نکاح کی زنجیر ڈال دی ۔ تصنیف
وتالیف سے بھی شاہ صاحب اسی لیے گریز کرتے تھے کہ اس سے نام و نمود کی بو
آتی ہے ۔

حقیقت کشمیر کی دوری کی وجہ کشمیر میں علمی ماحول کا فقدان تھا ۔ شاہ صاحب
کتابوں میں ہی جینا چاہتے تھے ۔ انہوں نے دیوبند کی طالب علمی کے زمانے سے لے
کر ۱۳۴۳ھ تک کی صدر مدرسی تک کئی کتب خانے جذب کیے تھے ۔ اور کشمیر پر سو
سال سے علمی اور سیاسی زوال کے گھناؤنے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ رفع یدین اور
آمین بالجہر کے مسائل پر مقدمے دائر ہوتے تھے اور ان مسائل کی تاویلیں غیر مسلم
ججوں کے فیصلوں پر موقوف رہی تھیں ۔ اس لئے شاہ صاحب جیسے سراسر علمی شخص
کے لئے کشمیر چھوڑنے کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا ۔ دارالعلوم دیوبند اس کے برعکس
علوم اسلامیہ کا گہوارہ تھا ۔ خود فرماتے ہیں کہ ہم ہندوستان آئے تو علم مولانا رشید
احمد گنگوہی کے پاس پایا پھر شاہ عبدالرحیم رائپوری کے اور حضرت الاستاد
شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاں ۔ اب اگر کسی کو دیکھنا ہو تو مولانا اشرف
علی تھانوی کے پاس جائے ۔ اس زمانے میں شاہ صاحب نے ہی کشمیر نہیں چھوڑا بلکہ
ان سے کچھ ہی مدت قبل مولانا صدرالدین آزردہ ، مولانا رشید الدین خاں ،

علامہ تفضل حسین، مرزا محمد بن عنایت، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ جیسے کثیر الاصل علماء کے اسلاف نے کشمیر کو خیر آباد کہا تھا اگر شاہ صاحب کشمیر ہی میں رہتے تو کبھی "علامہ" نہیں ہوتے اس لئے ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ اگر ایک طرف حضرت مولانا انور شاہ دارالعلوم دیوبند کی قبائے عظمت کے تکمۂ زریں ہیں تو دوسری طرف یہ دارالعلوم دیوبند ہے کہ "انور شاہ" کو دین و دانش کا "مہر انور" بنا دیا ع

این دو شمع اند کہ از یکدگر افروختہ اند

## حصہ دوم

کتاب کے دوسرے حصے میں مولانا انور شاہ کشمیری کے چند سر آورده تلامذہ کے بسیط مقالات ہیں۔ یہ مقالات انہوں نے مولانا ازہر شاہ قیصر کی کتاب "حیات انور" سے لئے ہیں۔ اور قیصر صاحب سے اجازت بھی حاصل کی ہے یہ حصہ ۲۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ چند مضامین شاہ صاحب کے دیگر متعلقین کے ہیں۔ ان میں مولانا احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ (داماد علامہ کشمیری) کا مضمون قابل ذکر ہے۔ یہ بڑا عالمانہ مضمون ہے مگر محدث ابن حزم اور علامہ ابن تیمیہ رح پر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس کا لب و لہجہ ذرا تند و تیز ہو گیا ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب ان دونوں فضلاء کے تفردات پر تنقید تو کرتے تھے مگر ان کے علم و فضل کے دل سے قائل تھے ابن حزم کی مشہور کتاب "المحلی" کو ایک جلیل القدر اور رفیع الدرجہ کتاب مانتے تھے۔ اسی طرح ابن تیمیہ کی طبیعت کی تیزی سے نالاں ہونے کے باوجود انہیں "شیخ الاسلام" اور "الحافظ المتبحر" کہہ کر پکارتے تھے۔ مولانا رضا صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ مضمون کی مناسبت سے بغیر مقابلت کے بارے میں شاہ صاحب کے ارشادات بھی واضح کرتے۔ اسی طرح وہ

(علامہ کشمیری) اگر حضرت سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیل شہید دہلوی کے لئے اعلیٰ اور وقیع کلمات استعمال کرتے ہیں تو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے لئے "بلید الذہن" اور "قلیل العلم" جیسے ریمارک کیوں بولتے ہیں۔ اس پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ اس حصے میں تین اور مضامین ایسے ہیں جنہیں مرتب نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ ان میں ایک قادیانیت سے متعلق ہے جو ۲۲ بائیس صفحات پر مشتمل ہے مگر یہ سارا مضمون (بالخصوص ص ۴۵۸ تا ۴۸۵) مولانا احمد رضا صاحب کی کتاب نطق الانور سے بلا ترمیم و تبدیل لیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون شاہ صاحب کے سیاسی نظریات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں صفحہ ۴۹۰ تا ۴۹۵ مبلغ چھ صفحات حیاتِ انور کے ایک مضمون سے لئے گئے ہیں، جو مولانا ازہر شاہ قیصر کی طرف منسوب ہے۔

## تیسرا حصہ

یہ حصہ بھی کم و بیش نو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں شاہ صاحب اور ان کے برگزیدہ اور سربرآوردہ ہمعصر علماء کے باہمی تعلقات و روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مضامین میں ایسی ایک بات بھی نہیں ملتی ہے جو حیاتِ انور سے خارج ہو، مرتب نے حیاتِ انور کے مضامین سے متعلقہ اقتباسات لاکر ان پر نئی سرخیاں باندھ لی ہیں۔ یہاں چند ضروری اور غیر ضروری باتیں رسالہ دار العلوم اور نقشِ حیات سے لی گئی ہیں۔ غیر ضروری ہم نے اس لئے کہا کہ اگر آپ "مولانا آزاد اور حضرت شاہ صاحب" کا مضمون پڑھیں گے، جو پانچ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ تو یہاں قابلِ قبول اور متعلق موضوع بات ایک ملے گی، کہ مولانا آزاد کسی زمانے میں شاہ صاحب کو مدرسہ عالیہ کلکتہ لانا چاہتے تھے۔

یہ حصہ بھی باوجود اس کے تاریخی ہونے کے باوجود مرتب کی ملمع کاری سے ایک فن پارہ بن گیا ہے اور کئی جگہوں پر ایسی ناحق شگوفے کئے ہیں بلکہ ایسا جھوٹ بولا ہے کہ شرم سے نگاہیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ ہم دو مثالیں بیان کرتے ہیں۔

(۱) مرتب محترم کو مولانا عبید اللہ سندھی اور علامہ کشمیری کے تعلقات سے متعلق مولانا مدنی کی نقش حیات سے ایک جملہ ملا ہے اور حسب عادت اس کو رنگ و روغن چڑھانے لگے۔ مولانا مدنی نے ایک اہم تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ علامہ کشمیری سے مولانا سندھی کی ایک غلط فہمی کی بنا پر ہو گئی تھی۔ اس پر الانور کے مرتب لکھتے ہیں جو ان دو فاضل ہستیوں کے درمیان اٹھنے والے جس سے کئی مسائل زیر بحث آجاتے اور کہیں کہیں اختلافات بھی ہو جاتے تھے ...... خاص کر ما بعد الطبیعیات کی دنیا کے مسائل کی علمی موشگافیوں میں بھی دونوں کے درمیان بحث و تکرار کا سلسلہ ہوتا تھا۔ آخر ایسے دو بڑے شخصیتوں سے یہ توقع کون رکھ سکتا ہے کہ وہ اپنے موقف پر ہر نکتے پر ایک دوسرے سے متفق رہیں گے۔ کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان اسی قسم کے علمی مباحثات کے دوران کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ کشمکش ہو جاتی تھی۔ (الانور ص ۱۱۶)

حالانکہ یہ واقعہ ہی نہیں ہے اگر ایک بھولا بھالا آدمی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا ہے کہ وقت کے دو بزرگ بدترین علماء علمی ادا وہ بھی بقول مرتب کے ما بعد الطبیعیات کے مسائل پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر جب سندھ واپس لوٹے تو وہاں پر تعلیم و تعلم اور اصلاح و تزکیہ نفس میں مصروف ہو گئے۔ پورے بارہ سال بعد یعنی سنہ ۱۳۲۷ھ میں مولانا محمود حسن (شیخ الہند) نے

انہیں دیوبند بلایا اور "جمعیۃ الانصار" میں کام کرنے کا مشورہ دیا، جو انگریزوں کے خلاف ایک سیاسی تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا مرکز اس زمانے میں دیوبند ہی میں تھا، اور مولانا سندھی کا قیام اس زمانے میں دیوبند ہی میں چار سال تک رہا۔ اسی چار سالہ مدت میں مولانا سندھی اور دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ و ارباب اہتمام کے درمیان سیاسی نوعیت کے اختلافات ہوئے۔ مولانا سندھی نے شیخ الہند کے ایما پر سیاست میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور یہ دونوں (مولانا سندھی اور شیخ الہند) دارالعلوم کو علمی مرکز کے علاوہ انگریزوں کے خلاف ایک مستحکم سیاسی قلعہ کی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہتے تھے مگر یہ چند اساتذہ دیوبند ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ حالات پیچیدہ ہوئے اور مذہبی عقائد بھی الجھ گئے، یہاں تک کہ نوبت تکفیر تک پہنچی۔ ارباب دیوبند کی یہ اظہار ناراضگی نہ صرف مولانا سندھی کے خلاف تھی بلکہ خود اُن کے علمی سرپرست اور استاذ الاساتذہ شیخ الہند کے خلاف بھی تھی[1]۔ جب حالات زیادہ پیچیدہ ہوئے تو شیخ الہند نے مولانا سندھی کو دیوبند سے نکلنے کا مشورہ دیا، اور دلی میں "نظارۃ المعارف" قائم کرنے کی ہدایت دی۔ مولانا سندھی نے نظارۃ المعارف کا قیام دلی میں عمل میں لایا۔ اور انہیں یہاں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے کا موقعہ ملا۔ دلی میں مولانا سندھی دو سال تک رہے۔ اس کے بعد ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں اپنے استاد اور مربی

---

[1] مکاتیب شبلی ملاحظہ کی جائے۔

شیخ الہند کے حکم پر کابل کی طرف روانہ ہوئے رسلہ[۲]

غرض مندرجہ بالا معاملات کا تعلق ایک سیاسی اختلاف سے ہے، اختلاف معمولی نوعیت کا نہ تھا بلکہ شاہ صاحب نے مولانا سندھی کو کافر قرار دے کر ان کی تکلیف کا باعث ہوئے تھے جس کا شاہ صاحب کو احساس ہوا اور اس کی تلافی اس طرح کہ وہ دیوبند ہی سے مولانا سندھی کے نام مکہ معظمہ پیغام بھیجا تھا کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ کے لیے کوئی رنج نہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائینگے۔"

مولانا سندھی اور شاہ صاحب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت و اخلاص قائم رہا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی کو شاہ صاحب کی تکلیف نے غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا۔ ان کے ایک شاگرد لکھتے ہیں:۔

"استاذی حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے قیام کے زمانہ میں دارالعلوم کی ساری داستان مختلف اوقات میں بیان فرماتے رہتے تھے ان میں سے علامہ کشمیری کا حضرت سندھی کی تکفیر کر دینے کا بھی ذکر

---

سلہ[۲] ذاتی ڈائری، مولانا عبیداللہ سندھی، ص ۲۰، ادبستان لاہور، طبع اول سنہ ۱۹۴۶ء، حیات امجیلی: قاضی محمد عبدالغفار، ص ۱۲۹-۱۳۰، مولانا عبیداللہ سندھی: محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، طبع سوم سنہ ۱۹۶۷ء

آگیا تھا یہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔"[1]

اس واقعے کی طرف رولٹ کمیٹی میں بھی اشارہ موجود ہے، اس سیاسی حادثہ میں علماء دیوبند ایک طرف تھے۔ اور دوسری طرف مولانا سندھی۔ البتہ یہ حضرت علامہ انورشاہ صاحب کی عالی حوصلگی تھی کہ اپنی غلط فہمی کا بر وقت احساس کر کے معافی مانگی، عجیب ہے انا النور کا مرتب مالبد الطبیعات کی دنیا میں فوراً پہنچ جاتا ہے حالانکہ بات اس کام کی بحث دنیا کی ہو رہی ہے۔

رہا مرتب محترم نے ایک مضمون حضرت مولانا انورشاہ کشمیری اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہما کے باہمی تعلقات اور اخلاص و محبت پر بھی لکھا ہے، جو دو صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ پہلے صفحہ پر انہوں نے مولانا علی میاں (مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ") اور (پروفیسر) رشید احمد صدیقی کے دو قول نقل کئے ہیں مگر ان کا حوالہ نہیں دیا ہے، یہ دونوں قول مرتب نے حیاتِ انور طبع دوم صفحہ ۱۵۲-۱۵۷ کے مضمون سے لئے ہیں یہ مضمون کبھی "دارالعلوم" میں بھی شائع ہوا ہے ممکن ہے مرتب نے دارالعلوم ہی سے لئے ہوں، پھر دوسرے صفحہ پر لکھتے ہیں اور خط کشیدہ عبارت غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔

"حضرت شاہ صاحب کی رحلت پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک گرانقدر اور بسیط مضمون سپرد قلم کر کے اپنے موقر جریدہ "معارف" میں شائع کیا جس میں حضرتِ موصوف نے نہایت شاندار الفاظ میں خراج

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام: نجم الدین اصلاحی ج ۲ ص ۶۹ م ۲ (حاشیہ)

مفید ونہ پیش کیا۔ اس مضمون میں حضرت ممدوح نے شاہ صاحب کی علمی عظمت کا اعتراف، ان کی دینی خدمات کی تعریف و توصیف اور اپنے دردِ دل کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ قابلِ مطالعہ ہے۔" پھر آگے لکھتے ہیں، غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔

"خوفِ طوالت اور قلّتِ گنجائش کی وجہ سے اس مضمون کے کچھ منتخب حصے کو ذیل میں نذرِ ناظرین کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔" (الانور ص ۹۰) حالانکہ علامہ سید سلیمان ندوی نے شاہ صاحب کی وفات پر نہ کوئی طویل مقالہ ہی لکھا اور نہ مختصر۔ بلکہ حسبِ عادت "معارف" کے شذرات میں چند سطور میں شاہ صاحب کی وفات پر اظہارِ افسوس کیا۔ شذرات کے انہی سطور کو لفظ لفظ مرتب نے کتاب میں درج فرمایا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مصنّف نے "معارف" کا شاید ایک پرچہ بھی نہ دیکھا ہے۔ یہ سطور انہیں حیاتِ انور طبع دوم صفحہ ۱۷۳ پر مل میں قاری رضوان اللہ کی کتاب سے۔ قرینہ اسی کی تائید کرتا ہے کہ قاری رضوان اللہ صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۶ پر جہاں یہ سطور درج کئے ہیں، وہاں آخر پر "ملتقطاً" کا لفظ بھی لکھا ہے، اور ہمارے مرتب الانور نے بھی یہ دونوں الفاظ اسی شکل و صورت میں لکھ دئے ہیں۔ مرتب نے لمبے ماخذ کی فہرست میں "معارف" (جولائی ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۲ء) کی فائلوں کا مطالعہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے، مگر ہماری رائے میں انہوں نے شاید معارف کا ایک بھی پرچہ نہیں دیکھا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں اس طرح

سامنے آتے ہیں گویا نادرۂ روزگار محقق ہیں۔[1] اور اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کے یہ الفاظ پڑھنے کے قابل ہیں۔

"معلوم ہوتا تھا کہ کسی مسند کی امامت کو بیٹھ بالیے کا ذریعہ بنالیا یا ختم خوانی اور تعویذ نویسی کے پیشے کو آڑ میں لوگوں کے صدقات و خیرات سمیٹنا یا جاہل بلب موروثی پیری مریدی کو چمکانے کے کچھ گر سیکھ لینا ان کے بڑے بڑے مقاصد ہیں۔" ص ۱۲۷

یہ الفاظ اُن علماءِ دین کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، جو حضرت شاہ صاحب کے دارِ کشمیری عتبے پر فرش راہ ہوتے تھے اور اُن کے سامنے اپنا اثر و رسوخ اور حقیقی یا مصنوعی عظمت و رفعت خاک میں ملا کر تلمیذ انہ انداز میں بیٹھ کر فخر و سرور محسوس کرتے تھے میں حرم مرتب سے ایک مُلّا زادہ ہونے کی حیثیت سے یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ جب دینی علماء اور مذہبی رہنما ان گھناؤنے اور کردہ الفاظ کے مستحق ہوئے تو اب آپ خود اپنے علم و تحقیق اور صداقت و دیانت کی روشنی میں، جن کو کچھ بھی تو ہم نے نہیں تھے "اپنے لئے صحیح نام تجویز کریں۔ اور اس میں اپنے اس حرم دیانے سے بھی مدد لیں جن کی فیض تربیت میں الانور لکھی گئی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو "الانور" کا عرض حال

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"آج کل جو فتوی فروش مفتی اور ترکم پرست ملا فتوی لکھنے سے پہلے ہی چکا لیتے ہیں کہ اجرت فتوی حاصل کرتے ہیں ..." الانور: ص ۴۷۰ حاشیہ

ممکن ہے اس دعوی میں کچھ صحت بھی ہو مگر "الانور" کی روشنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کچھ مفتی صاحبان فتوی فروش ہیں تو آپ علامہ انور شاہ کشمیری کے ہزاروں بلکہ لاکھوں عقیدتمندوں میں ایک ایسے معتقد بھی نکلے جن کو انور فروش کا نام دیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں جو حضرت شاہ صاحب اور علامہ علی حنبلی کے تعلقات پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ لفظ بلفظ حیات انور کے ایک مضمون[1] سے ماخوذ ہے تعجب ہے مرتب نے حضرت مضامین میں اس مضمون کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی حصے میں مولانا سید شبیر احمد اندرابی نے جو چند صفحات کا مضمون لکھا ہے اس کے کئی اجزا بلاشبہ اہم ہیں۔ مولانا اندرابی مشہور عالم مولانا میرک شاہ اندرابی کے فرزند ہیں جو علامہ کشمیری کے خاص شاگرد تھے اور علامہ کشمیری، سرینگر وارد ہونے پر انہی کے ہاں قیام کرتے تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو حیات انور میں مولانا محمد انوری لائلپوری کا مضمون: از صفحہ ۲۱۴ - ۲۱۹

## چوتھا حصہ

یہ کتاب کا آخری حصہ ہے اور شعر و شاعری سے متعلق ہے۔ شاہ صاحب کی شاعری کے ضمن میں وہ مبسوط با ترجمہ و تشریح قصیدہ بھی شامل ہے جو آج سے نصف صدی پہلے (۱۹۲۵ء) صدع النقاب عن جساسۃ الفنجاب کے نام دیوبند سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کچھ کشمیری اور غیر کشمیری علماء کے مراثی درج کیے ہیں۔ اس کے آخر میں تین تتمے ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) پہلے تتمے میں حضرت شیخ الہند کے حالات درج کیے ہیں اس کا مواد مولانا مدنی کا رسالہ "اسیر مالٹا" اور مولانا محمد میاں کا رسالہ "علمائے حق" ہے۔ مرتب نے وہ کتاب دیکھی ہی نہیں ہے جو "شیخ الہند" کے نام سے کئی سال پہلے شائع ہوئی ہے اور جس کے مصنف کو اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔

(۲) دوسرا تتمہ بیس صفحات میں چھپا ہوا ہے اس میں شاہ صاحب کے جدِ امجد شیخ مسعود نروری کے حالاتِ زندگی اور پھر ان کے اخلاف کے حالات درج کیے گئے ہیں۔

(۳) تیسرا تتمہ شاہ صاحب کے مسئلہ سیادت سے متعلق ہے اس کو مرتب نے اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا شاہ صاحب کے سید نہ ہونے کا واقعہ سب سے پہلے انہوں نے ہی انکشاف فرمایا ہے۔

بات صاف اور کھلی ہوئی ہے کہ علامہ کشمیری سادات سے نہیں تھے۔ اپنی اکثر تصانیف میں انہوں نے اپنا مختصر شجرۂ نسب بھی لکھا ہے اور کہیں

"سید" ہونا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ جیسا کہ مشہور ہے ایک بار سُنا کہ لوگ غلط فہمی کی بناء پر انہیں سید لکھتے ہیں تو صاف الفاظ میں تردید کی، اسی طرح جن علماء نے آج تک ان پر تحقیق کے ساتھ کچھ لکھا ان میں سے کسی بھی شخص نے سید نہیں لکھا مولانا احمد رضا بجنوری اور قاری محمد رضوان اللہ نے کھل کر لکھا کہ شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب امام اعظم ابو حنیفہ کی ذات سے ملتا ہے۔ مدرسۂ امینیہ کے بانی اور شاہ صاحب کے ایک قدیم رفیقِ کار مولانا امین الدین صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

"بڑی حیرت اور خوشی کی بات ہے کہ جناب مولانا انور شاہ صاحب امام ابو حنیفہ کی اولاد میں سے ہیں" (روداد مدرسۂ امینیہ دہلی سنہ ۱۳۱۵ھ: ص ۱۰)

اسی طرح ہمارے کشمیر کے مورخ محمد الدین فوق نے تاریخ اقوام کشمیر میں بہت طویل مدت پہلے شاہ صاحب کا شجرۂ نسب اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اس نے شاہ صاحب کے والد کے ہاں ان کا خاندانی شجرہ دیکھا تھا جس پر شاہ صاحب نے اپنے قلم سے اصلاح بھی کی تھی۔ پوری تحقیق کرنے کے بعد فوق مرحوم نے سید لکھنے کا ذمہ دار ان کے بڑے صاحبزادے مولانا ازہر شاہ صاحب کو ٹھہرایا ہے غرض مولانا انور شاہ کے خاندان کا سادات سے غیر متعلق ہونا اظہر من الشمس ہے ہاں ان کے بہت سے معتقدین (جن میں ان کے تلامذہ بھی شامل ہیں) احتراماً ان کے لئے "سید" استعمال کرتے ہیں۔ یہاں سید ذات کے مفہوم میں نہیں بلکہ

عربی زبان میں "سید" کے معنی میں بولا جاتا ہے، ممکن ہے کچھ حضرات کو واقعی غلط فہمی ہو اور وہ انہیں واقعی "سید" نسباً سمجھتے ہوں، مگر محققین کیسے اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔

ہمارے مندرجہ بالا رائے کی تائید مولانا عبدالحلیم چشتی کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"جس طرح علمی دنیا میں دقتِ نظر، معقولیہ میں مہارت اور جلالتِ علمی کی وجہ سے علی بن محمد جرجانی (المتوفی ۸۱۶ھ) کو علامہ سید شریف جرجانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسی طرح محمد انور شاہ کو اہلِ علم کے طبقہ میں علامہ سید انور شاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔" معارف ۱۹۶۷ء، نومبر

تنبیہ: مرتب الانور نے یہی مولانا چشتی کا مقالہ اپنی کتاب میں شامل کیا ہے جس سے مندرجہ بالا الفاظ ماخوذ ہیں، مگر مرتب نے اپنی تحقیق کے زعم میں مندرجہ بالا الفاظ میں "علامہ سید انور شاہ" سے سید حذف کیا ہے۔[1] مرتب کو چاہیے کہ اپنی کتاب ہی میں ص: ۲۴۷ میں جہاں آخر تا "سید انور شاہ" لکھا گیا ہے اس پر بھی خطِ تنسیخ پھیر دے۔

کتاب کے آخر میں محترم مرتب نے اپنے ماخذ کی فہرست دی ہے وہ عربی ۵۵، فارسی ۳ اور اردو کی ۱۰۶ التصانیف، انگریزی کے چودہ ۱۴، چھ ۶ قلمی نسخے اور نو ۹ جرائد

[1] الانور: ص ۳۰۴

کا نام دیا ہے اگر مصنف کو اپنی کتاب میں ان ہی کتابوں کا نام لینا ضروری ہوتا ہے
جن سے اس کی کتاب ماخوذ ہوتی ہے، تو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اتنی لمبی فہرست
پیش کرکے مرتب نے قارئین کی آنکھوں میں دھول جھونک دی ہے مرتب محترم
کی کتاب کا وہ حصہ جو انہوں نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، چند گنی چنی کتابوں سے
ماخوذ ہے۔

# مقالات

مستقل کتابوں کے علاوہ علامہ کشمیری کی سوانح حیات پر مضامین و مقالات
کی شکل میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے "حیات انور" بھی انہی مضامین و مقالات
کا انتخاب ہے۔ رسالہ "دارالعلوم" دیوبند "الحرم" میرٹھ "الرحیم" حیدرآباد سندھ
"بینات" کراچی "برہان" دہلی وغیرہ میں بہت کچھ شاہ صاحب پر چھپ گیا
ہے، اسی طرح عربی زبان میں چھپنے والے رسائل و اخبارات میں "الداعی" دیوبند
"دعوۃ الحق" دیوبند "الصوت الشرق" قاہرہ وغیرہ کے ذریعہ بھی شاہ صاحب
کی شخصیت متعارف کی گئی۔ حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہ نے تحریر فرمایا
ہے کہ علامہ محمد زاہد الکوثری مصری نے بھی شاہ صاحب پر ایک مقالہ لکھا تھا
جو اُن کے مقالات میں شامل ہے، مگر افسوس ہے راقم کو علامہ کوثری کے مجموعہ
مقالات میں، جو مقالات الکوثری کے نام سے مولانا محمد یوسف بنوری اور
پیر وغیرہ محمد ابوزہرہ مصر کے مقدمات کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں، شاہ صاحب

یہ کوئی مقالہ نہ تھا بلکہ رد قادیانیت پر علامہ کوثری نے جو مضمون لکھا ہے۔
اس میں علامہ کشمیری کی فاضلانہ کتاب اکفار الملحدین کی بے حد تعریف کی گئی ہے
ممکن ہے علامہ کوثری کے مقالات کا کوئی اور مجموعہ چھپ گیا ہو، راقم کے سامنے
وہی مجموعہ ہے جو مطبعۃ الانوار قاہرہ میں چھپ گیا ہے۔

غرضیکہ یہ سارے مضامین مفید ضرور ہیں مگر تحقیقی نہیں ہیں۔ ان کو نوادر کے
مضامین کی فہرست میں شامل کرنا زیادہ مناسب ہے۔ چند مضامین ایسے ہیں جو شاہ
صاحب کی تصانیف پر بطور مقدمہ شائع ہوئے ہیں۔ جیسے مقدمہ مشکلات
القرآن، مقدمۃ عقیدۃ الاسلام، مقدمۃ فیض الباری،
یہ تینوں مقدمے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کے رشحات قلم ہیں۔ مقدمۃ
عقیدۃ الاسلام (مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۶۷ء) کا ترجمہ مولانا محمد ادریس صاحب
نے کیا تھا جو "بینات" کراچی میں بالاقساط چھپ گیا ہے۔

ان مضامین میں ہم پانچ مقالات کا تعارف تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ
پیش کریں گے۔ ان میں تین مقالات اردو اور ۲ دو عربی میں ہیں۔

(۱) قادیانی فتنہ اور حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری
از مفتی محمد شفیع صاحب (سابق مفتی اعظم پاکستان)

(۲) یتیمۃ البیان لمقدمۃ مشکلات القرآن
مولانا محمد یوسف صاحب بنوری

(۳) امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری، از مولانا عبدالحلیم چشتی

(۴) تذکرہ شیخ الاسلام ........ مولانا انور شاہ کشمیری

مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری

(۵) ترجمۃ مولانا انور شاہ کشمیری: مولانا عبدالحی حسنی

و مولانا ابوالحسن ندوی۔

(۱) قادیانی فتنہ اور حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری۔

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں "برہان" "معارف" "البعث الاسلامی" "دارالعلوم" وغیرہ بیسیوں اخبارات و رسائل میں پچھلے سال ان کے حالات اور علمی خدمات پر مضامین شائع ہوئے مفتی صاحب، ہمارے شاہ صاحب کے فاضل ترین شاگردوں میں سے تھے۔ محدث و مفسر ہونے کے باوجود ان کی فقہی خدمات سب پر غالب ہیں۔

زیر تبصرہ مقالہ آج سے ۲۲ سال پہلے حیات انور میں شائع ہوا تھا مگر معلوم نہیں کن وجوہ اور مصالح کی بناء پر علامہ انور شاہ جیسے مجاہد، مخلص اور اسلام دشمن عناصر کے خلاف شمشیر براں کے فرزند نے اس مضمون کو دوسرے ایڈیشن میں شامل نہ کیا۔

اصل میں شاہ صاحب اور تحریک قادیانیت مستقل موضوع تحقیق اور ایک مستقل کتاب کا محتاج ہے۔ اس مذہب کی حقیقت واضح کرتے اور بانی مذہب کے چہرے سے پردہ نوچنے میں علامہ کشمیری نے جو علمی اور لسانی خدمات انجام دیے ان کو مد نظر رکھ کر وہ یقیناً مجدد عصر اور مصلح اعظم تھے۔ جو کسی کو کی محقق شاہ صاحب

کی اس تجدیدی خدمت پر قلم اٹھائے گا، اُسے لازماً مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی کتاب "الوزر الوری" کے بعد حضرت مفتی صاحب کے زیرِ تبصرہ مضمون کو بنیادی حیثیت دینی پڑے گی۔

اس مضمون میں پہلے شاہ صاحب کی تحفظِ دین کے لیے بے چینی اور دل سوزی بیان کی گئی ہے پھر یہ بتایا کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی جانتے کیا تھے۔ اس مذہب کے ہلاکت آفرین نتائج واضح کرنے کے بعد شاہ صاحب کی تحریری خدمات سے تعرض کیا۔ اوّل یہ کہ انہوں نے کس طرح اپنے شاگردوں کو مختلف موضوعات جیسے ختمِ نبوت، عقیدۂ رفع و نزولِ عیسیٰ، قادیانی مذہب کے بانی کی سیرت وغیرہ تفویض فرما کر اردو اور عربی میں گرانقدر لٹریچر تیار کرایا۔ پھر خود مختلف موضوعات پر پانچ رسالے لکھے۔ عربی میں لکھنے پر اس وجہ سے زور دیتے تھے کہ یہ فتنہ ضرور عالمِ عربی میں بھی سر نکالے گا۔ اس کے بعد چند اہم مناظروں کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں جن میں فیروزپور، راولپنڈی، مالیرہ، گجرات، گوجرانوالہ، امرتسر، لدھیانہ وغیرہ کے تبلیغی جلسے اور مناظرے قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں مشہور مقدمہ بہاولپور کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے جس میں خود مضمون نگار نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

یہ ذکر کرنا نامناسب ہوگا کہ شاہ صاحب کا ایک رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزولِ المسیح" حضرت مفتی صاحب ہی نے مرتب فرمایا ہے اور اس کے شروع میں ایک مقدمہ سلیس عربی زبان میں لکھا تھا۔ مولانا عبد العالم صاحب میرٹھی نے یہ رسالہ مفتی صاحب ہی کی طرف منسوب کیا ہے[1] جو درست نہیں ہے۔ رسالے کا سارا سواد علامہ کشمیری ہی نے جمع کیا تھا، ترتیب اور مقدمہ حضرت مفتی صاحب کے ہاتھ سے ہے۔ اسی طرح شاہ صاحب کے ایک دوسرے عربی رسالہ "اکفار الملحدین" کے آخر پر مرزا غلام احمد قادیانی کی اردو تصانیف کے اقتباسات کا ترجمہ بھی مفتی صاحب ہی نے انجام دیا ہے۔

(۲) یتیمۃ البیان: مولانا محمد یوسف صاحب بنوری

---

[1] ترجمان السنۃ ج ۳ ص ۵۲۶ طبع ندوۃ المصنفین دہلی۔

یہ کتاب مولانا بنوری نے لکھی ہے جن کی ایک تصنیف "نفحۃ العنبر" پر ہم نے پہلے ہی تبصرہ لکھا ہے
آج سے طویل مدت پہلے جب علامہ کشمیری کی کتاب "مشکلات القرآن" شائع ہوئی تو "یتیمۃ البیان" مقدمہ
کتاب کے طور پر شامل کیا گیا۔ یہ مقدمہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں شاہ صاحب کی سوانح
اور علمی کمالات بیان کئے گئے۔ اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا وہ قرآن مجید کے علوم سے متعلق ہے اس کی بڑی اہمیت اور
خصوصیت یہ ہے کہ فہم قرآن سے متعلق علامہ انور شاہ کے افادات اور خیالات درج کئے گئے ہیں۔ اول یہ واضح
کیا گیا ہے کہ علامہ کشمیری کی قرآنی بصیرت کیسی تھی، قرآن سمجھنے اور قرآن سمجھانے میں ان کے پاس کیا فرق ہے؟
طبقات مفسرین پر انکی نظر کتنی گہری تھی، قرآن مجید کا اعجاز اور بلاغت کے کتنے شناور تھے؛ کہتے ہیں
کہ علماء میں مشہور ہے کہ لَمْ یَتَدَبَّرْ اِعْجَازَ الْقُرْآنِ اِلَّا الْاَعْرَجَانِ قرآن کا اعجاز بس
دو لنگڑے ہی جانتے ہیں دو لنگڑوں سے مراد علامہ جار اللہ زمخشری اور علامہ عبدالقاہر جرجانی ہے مگر علامہ
کشمیری فرماتے تھے: لَمْ یَتَدَبَّرْ اِعْجَازَ الْقُرْآنِ اِلَّا الْاَعْرَجَانِ وَاَنَا ثَالِثُهُمَا قرآن کا
اعجاز بس دو لنگڑے ہی جانتے ہیں مگر میں ان کا تیسرا ہوں۔

اعجاز قرآن میں علامہ کشمیری کا مقام و مرتبہ معین کرنے و قدم "دو دفاع" اور "موقف" کے
فرق پر انہوں نے جو تحقیقات پیش کی ان میں بطور نمونہ چند نقل کئے ہیں پھر چند اہم قرآنی مسائل
جیسے قرآن کے مقاصد، تفسیر بالرائے، معانی قرآن کی گہرائی اور گیرائی، ناسخ و منسوخ وغیرہ علامہ
کشمیری کے افادات کی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ ناسخ و منسوخ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ علامہ کشمیری کسی
بھی قرآنی آیت کا مطلق منسوخ ہونا تسلیم نہیں کرتے تھے۔

مولانا بنوری نے اس میں اپنی طرف سے بھی بہت کچھ اضافہ کیا ہے، اس میں دلچسپ اور قابل
مطالعہ وہ صفحات ہیں جن میں سرسید کی "تفسیر"، عنایت اللہ مشرقی کے "تذکرۃ" اور مولانا
ابوالکلام آزاد کے "ترجمان القرآن" پر تبصرہ کیا گیا ہے اور کڑی تنقید کی ہے مولانا آزاد کے بیان کی

خدمات اور اردو اسلوبِ بیان کی بیلے خوب تولیف کی ہے مگر قرآن مجید میں جہاں انہوں نے ردِ مرزائیت اور شریعتِ اسلام کے منافی خیالات ظاہر کیے ہیں اُن کی تردید کی ہے اور بلا شبہ یہ محققانہ تردید ہے اس محققانہ تنقید کا ترجمہ ایک عالمِ دین نے رسالہ دار العلوم دیوبند میں شروع کیا تھا جس کی اشاعت مولانا آزاد مرحوم نے رکوادی تھی۔[1] "مشکلات القرآن" علامہ کشمیری کی دوسری کتابوں کی طرح مشکل ہے مگر یہ مقدمہ آسان ہے اور فصیح و بلیغ عربی زبان میں لکھا گیا ہے۔

(۳) امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری: مولانا عبد الحلیم چشتی

مولانا چشتی علوم عصریہ کے اعلیٰ سند یافتہ اور دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ اُن کے بلند پایہ تحقیقی مقالات برصغیر کے مشہور اور اعلیٰ جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ ان میں حسن صغانی لاہوری (مؤلف مشارق الانوار) مقدمہ الاتقان فی علوم القرآن اور فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ نہایت مشہور اور فاضلانہ کارنامے ہیں۔ "الرحیم" حیدر آباد سندھ کے اکثر شمارے ان کے مقالات سے آراستہ ہوتے تھے۔

علامہ کشمیری پر اردو زبان میں جو چند گنے چنے مقالات آج تک شائع ہوئے ہیں ان میں زیرِ تبصرہ مقالہ سب سے محققانہ ہے موصوف نے علامہ کشمیری کے علوم میں گھس کر یہ جلیل القدر مضمون پیش کیا ہے۔ ابتدائی حصے میں علامہ کشمیری کی مختصر مگر جامع اور مستند حالاتِ زندگی لکھے ہیں اس کے بعد اُن کے چند وہبی کمالات جیسے قوتِ حافظہ، استحضارِ علوم، شدتِ نگاہی اور ربانی بصیرت وغیرہ دکھائے ہیں اور جگہ جگہ مستند واقعات اور مشاہدات شامل کیے ہیں۔ اس کے بعد اُن کے علم و فضل بالخصوص علومِ دینیہ عربیہ میں بے مثال تبحر اُن کے معاصرین کے اعتراف کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا اشرف علی تھانوی جیسے وسیع النظر عالم کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"مولانا انور شاہ صاحب بہت بڑے متبحر عالم تھے۔ میاں تک کہتے ہیں کہ حق بات یہ ہے... لیکن ..."[۳]

---

[1] انوار الباری: ج ۱ قسط سوم: ص ۱۸۰

بات کیوں چھپاؤں، میرا خیال ہے کہ وہ اپنے اکثر اساتذہ سے بعض علوم میں بڑھ گئے۔
دیگر اعترافات میں مولانا سید سلیمان ندوی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے اقوال و آراء قابل ذکر
ہیں۔ مقالہ نگار نے اُن چند مضامین کی نشاندہی کی ہے جو علامہ عثمانی نے اپنی شرح صحیح مسلم
میں حرفِ آخر کی حیثیت سے پیش کئے اور یہ مضامین علامہ کشمیری کی تحقیقات اور تفردات ہیں۔
حدیث کے باب میں اُن اصطلاحات کو واضح کیا ہے جو علامہ کشمیری نے علم حدیث کی اصطلاحات
میں اضافہ کئے ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ رشید رضا مصری کے سامنے شاہ صاحب نے عربی میں جو تقریر
کی تھی اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ فقہ میں علامہ کشمیری کے مخصوص فقہی مکتب اور فقہاء پر
تنقیدی اشارات پر بھی روشنی ڈالی ہے اہم مضامین میں شاہ صاحب کے طرزِ تحریر سے
تعرض کیا ہے۔ مقالہ نگار نے علامہ انور شاہ کے درسی تقاریر جمع کرنے والوں کی توصیف
و تحسین تو کی ہے مگر اس اہم کام کے لئے موزوں ترین اصحاب کے نہ ہونے پر افسوس کیا ہے۔

یہ مقالہ نومبر ۱۹۶۷ء میں "معارف اعظم" میں تین قسطوں (ستمبر، اکتوبر اور نومبر)
میں شائع ہوا ہے۔

(۴) الشیخ المحدث مولانا محمد انور شاہ بن مولانا محمد معظم شاہ

: مولانا سید احمد رضا بجنوری

یہ تذکرہ کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ مولانا رضا صاحب کی مشہور کتاب "انوار الباری"
کے مقدمہ کا ایک حصہ ہے۔ اس مقدمے میں اہم فقہاء و محدثین کا تذکرہ ہے گویا یہ
مقدمہ تذکرۃ المحدثین کا چھوٹا موٹا دائرۃ المعارف ہے جو اردو میں مستقل ہزار کتاب
کا ایک مختصر جز ہونے کے باوجود علامہ کشمیری کا تذکرہ ستاسی صفحات میں پھیلا ہوا
ہے۔

۴۔ ترجمۃ المولانا محمد انور شاہ الکشمیری: مولانا عبدالحی الحسنی رائے بریلوی ہندوستان کے ابن خلکان مولانا عبدالحی حسنیؒ المتوفی ۱۹۲۷ء کی جلیل القدر تصنیف نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر سے اہل علم واقف ہیں جو ہندوستان کے علماء و علماء کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کی آٹھویں جلد ہند کے اُن علماء کرام کے حالات پر مشتمل ہے جو مصنف کے ہم عصر تھے۔ انہی میں مولانا انور شاہ کشمیری کا تذکرہ بھی ہے جو "الشیخ العلامۃ الفاضل" الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ مصنف کتاب کو شاہ صاحب کے ساتھ ایک تعلق بھی تھا وہ یہ کہ ان کے فرزند ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی شاہ صاحب کے شاگرد تھے۔

"نزہۃ الخواطر" میں مصنف کے ہاتھ سے حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ نہایت مختصر تھا اور وہ بھی شاہ صاحب کی حیات سے تعلق رکھتا تھا مگر بعد میں اُنکے نامور فرزند حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے خطوط و جدانی میں مضمون کی شکل میں شاہ صاحب کے علم و فضل خداداد اوصاف، علمی اور دینی خدمات وغیرہ پر روشنی ڈالی یہ مضمون اگرچہ مختصر ہے مگر حضرت شاہ صاحب پر لکھی ہوئی کتابوں کا عطر اور مغز اس میں کھینچ آیا ہے حضرت شاہ صاحب کے مشہور سوانح نگار مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری نے بھی یہ تذکرہ بیحد پسند فرمایا تھا۔ اس کا اظہار خود حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی نے راقم سطور کے نام ایک چھٹی میں فرمایا ہے[1]۔ ترجمہ کے آخر میں علامہ کشمیری کی عربی شاعری میں وہ طویل قصیدہ بطور نمونہ کلام درج کیا ہے جو علامہ کشمیری نے مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر کہا تھا۔

---

[1] ۵ جولائی ۱۹۷۵ء از مقام رائے بریلی